افغانوں کی نسلی تاریخ

مصنّف

خان روشن خان

ناشر

روشن خان اینڈ کمپنی تاجران کتب

جونا مارکیٹ، پسوا چوک، کراچی ۲

تصنیف : افغانوں کی نسلی تاریخ
مصنف : روشن خان
ناشر : روشن خان اینڈ کمپنی جونا مارکیٹ
پھول چوک کراچی نمبر ۲
اشاعت اوّل : اگست ۱۹۸۱ء
تعدادِ اشاعت : تین ہزار
اشاعتِ دوم : اپریل ۱۹۸۲ء
تعدادِ اشاعت : دو ہزار
اشاعتِ سوم : ستمبر ۱۹۸۳ء
تعدادِ اشاعت : دو ہزار
طابع : مکتبۂ رشیدیہ (المخزن پرنٹرز)
قیمت : پانچ روپے

ملنے کا پتہ

روشن خان اینڈ کمپنی (تمباکو ڈیلرز)

پھول چوک جونا مارکیٹ، کراچی ۲

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال

[illegible]م افغان کی بے حسی پر غور کرتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن اب کچھ عرصے [illegible] ان میں اپنی قومی تاریخ سے دلچسپی، فکری تغیر اور ایک نئی زندگی کے آثار دیکھتا ہوں [illegible] خوشی ہوتی ہے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۸۱ء کا مذاکرہ اور اس کے موضوع سے دلچسپی نئی قومی زندگی [illegible] آثار اور فکری تغیر کی ایک واضح مثال ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے [illegible] تاریخ حافظ رحمت خانی" کے پشتو ایڈیشن کے بعد دو اردو ایڈیشن "اور تذکرہ ریشحات [illegible] کی اصلیت اور ان کی تاریخ" کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور دوسرے ایڈیشن [illegible] انتظام کرنا پڑا۔

۱۷ اپریل کے مذکورہ جلسہ کا موضوع بحث یہ تھا کہ افغان نسلاً کس خاندان [illegible] قوم سے تعلق رکھتے ہیں؟ اس سلسلے میں جو مکاتب خیال ہیں ان پر بحث اس مقالے [illegible] گئی ہے۔ یہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اُس نے اس حقیر کے خیالات کو اہل علم اور افغانوں کی تاریخ کا ذوق رکھنے والوں میں پذیرائی بخشی اور انھوں نے اس بات [illegible] اصرار کیا کہ یہ مقالہ شائع کیا جائے۔

[illegible] تحقیق و تصنیف کے دو انداز ہیں۔ بلکہ جب بھی کسی قوم کی تاریخ پر [illegible] جائے گی یہی انداز سامنے آئیں گے۔

[illegible] ہے کہ تاریخ کو اس طرح دیکھا جائے کہ اچھائیاں اور خوبیاں تو سب [illegible] اور قومی تاریخ کے کمزور پہلوؤں اور خامیوں کو تسلیم کرنے سے انکار [illegible] ہر یہ نقطہ نظر خوب ہے۔ لیکن جب بھی قلم غیر انصاف پسند اور متعصب [illegible] پہنچ جاتا ہے تو وہ تاریخ لکھتے وقت اُس قوم کی کمزوریوں اور

خامیوں سے استدلال کرتا ہے اور قومی تاریخ کی بالکل ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے۔
افسوس کہ پٹھانوں کی تاریخ کے ساتھ یہ ظلم بھی روا رکھا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز تحقیق و تصنیف انتہا پسندانہ ہے۔ اس طرح خواہ کتنی ہی خوبصورت کتابیں چھاپ لی جائیں لیکن اہل علم و اصحاب عدل میں یہ انداز پسند نہیں کیا جاتا۔ میں اپنے قارئین پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ میرا انداز تحقیق اور مقصد تصنیف نہیں ہے۔ پٹھانوں کی قومی تاریخ کی جہاں تک عظیم الشان روایات اور ہمارے اسلاف کے بے نظیر کارناموں اور بے مثال سیرت کا تعلق ہے میں اسے اپنی قومی میراث سمجھتا ہوں اور اس پر فخر کرتا ہوں اور جہاں تک قومی تاریخ کی خامیوں کمزوریوں اور کوتاہیوں کا تعلق ہے اور جو باتیں تاریخ سے ثابت ہیں، میں ان سے انکار نہیں کرتا۔ میں ان سے سبق حاصل کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ قوم کے نوجوان بھی ان سے عبرت حاصل کریں۔

۲۔ دوسرا انداز خالص علمی و تاریخی ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کی تاریخ صرف عظیم الشان واقعات و فتوحات سے بھری ہو اور اس قوم میں کسی قسم کی اخلاق و سیرت اور فکر و عقیدہ کی کوئی خامی اور کمزور پہلو نہ ہو۔ لیکن ایسی بھی شاید ہی کوئی قوم ہو جس کی تاریخ صرف پستیوں کی تاریخ ہو اور اس کا دامن فکر و عمل ہمیشہ اور ہر طرح کی خوبیوں سے خالی رہا ہو۔ واقعہ یہ ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ہر قوم کی تاریخ مختلف نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ اچھے اور برے دن سب پر آتے ہیں۔ فتوحات کے ساتھ شکستوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ حالات کی اسی الٹ پھیر کی طرف قرآن نے تلک الایام نداولہا بین الناس (ترجمہ۔ یہ ہار جیت کے اوقات ہیں جنھیں ہم انسانوں میں ادھر ادھر پھیرتے رہتے ہیں — ۳ : ۱۴۰) کے خطاب میں اشارہ کیا ہے۔ پس حقیقت پسند شخص وہ ہے جو کائنات کی اس سچائی کا انکار نہ کرے۔

الحمدللہ! میرا نقطہ نظر یہی ہے۔ قرآن اور اس کی بیان کردہ تمام حکمتوں پر میرا ایمان ہے۔ میں اس دائمی، عالمگیر اور قدیم سچائی سے انکار نہیں کرتا لیکن قرآن نے جو قدیم اقوام کے حالات بیان کیے ہیں ان کا مقصد بھی یہ بیان کیا ہے کہ موجودہ اور اس کے مخاطب انسان و اقوام ان واقعات سے عبرت حاصل کریں۔ وہ شخص بھی جو قرآن حکیم پر ایمان نہیں رکھتا، سوچے کہ اگر کسی تاریخ و تذکرہ سے لوگ اپنی زندگی کی راہوں کو روشن نہ کر سکیں تو تصنیف و تحقیق کی مشقت کا فائدہ کیا؟ پس جہاں اس مقالہ کی تحریر میں میرا نقطۂ نظر خالص علمی اور تاریخی ہے وہاں اپنے مطالعہ و تحقیق کے اس قرآنی مقصد کو ترک کر دینے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اسی جذبے کے تحت میں نے اس مقالہ کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے کہ قومی تاریخ کے مطالعے سے قوم کے نوجوان فائدہ اٹھائیں۔

اس مذاکرے میں جو دوسرے مقالے پیش کیے گئے تھے یہاں ان کے بارے میں کوئی اظہار خیال کرنا نہیں چاہتا۔ عمومی طور پر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ بعض حضرات قیاسات سے کام لیتے ہیں اور اسے نہ صرف تاریخ کا نام دیتے ہیں، بلکہ ان سے تاریخ کے غیر مشتبہ واقعات اور متفق علیہ قومی روایات کی تردید کا کام لیتے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض اوقات قیاس کو بھی دخل دینا پڑتا ہے لیکن قیاس کی بنیاد پر تاریخ اور صدیوں پر پھیلی ہوئی کسی قوم کی متفق علیہ روایات کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ اگر صدیوں پرانی تاریخ کو قیاس کی بنیاد پر رد کیا جا سکے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی بہت سی قوموں کے دامن میں تاریخ کا کوئی سرمایہ اور کوئی خوبی باقی نہیں رہتی۔ انسان کی ہر فکر و سعی میں غلطی اور خامی کا امکان ضرور ہوتا ہے۔ اپنی اس حقیر سعی کو بھی اس سے مبرا نہیں سمجھتا لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے اس کتابچے میں اپنے بہترین مطالعے اور تحقیق کو پورے اخلاص قلب اور دیانت سے مرتب کیا ہے۔ اگر ان افکار و تحقیقات سے قوم کی ایک چھوٹی سی جماعت اور چند افراد بھی فائدہ اٹھائیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت کا صلہ مجھے مل گیا۔

اس کتابچہ کو شائع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ قوم کے نوجوانوں میں تاریخ کے مطالعہ کا ذوق بھی پیدا کرے اور اسلاف کرام کے دینی افکار اور پاکیزہ سیرتوں سے انھیں اپنی زندگی کو منور کرنے کی توفیق بھی بخشے۔

روشن خان
۳۱ جولائی ۱۹۸۱ء

پیش لفظ

محمد پرویش شاہین، ایم۔ اے (اردو) ایم۔ اے (پشتو) ایم۔ اے (تاریخ)
ریسرچ سنٹر، منگلور۔ سوات

۱۷ اپریل ۱۹۸۰ء کو اکبر حیات کاکاخیل اور جناب اعجاز یوسف زئی نے بعد نماز جمعہ کمیونٹی سنٹر ہال، مردان میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے مہمان خصوصی میاں سید رسول رسا سابق ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی، پشاور تھے اور مذاکرہ کی صدارت کے فرائض سید تقویم الحق کاکاخیل پرنسپل گورنمنٹ کالج، پشاور نے انجام دیئے۔

مذاکرہ کا موضوع پٹھانوں کی نسلی تاریخ تھا اور حصہ لینے والے اہل علم و نظر میں سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل، قاضی عبدالحلیم اثر اور روشن خان تھے اور تینوں حضرات گویا کہ تاریخ کے تین مکاتب فکر اور نقطۂ ہائے نظر کے ترجمان تھے۔ تینوں حضرات نے زبانی اظہار خیال کے بجائے تین مقالوں میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خوش قسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے اس مذاکرہ میں شرکت کی تھی اور تینوں اصحاب فکر کے مقالات سننے کا موقع ملا تھا۔

سید بہادر شاہ ظفر صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ پٹھانوں کا تعلق آریوں کی نسل سے ہے۔ اس کے برعکس خان روشن خان کی تحقیق یہ ہے کہ پٹھان بنی اسرائیل ہیں اور تاریخ کے بے مثل واقعات اس پر شاہد عدل ہیں۔ جب کہ عبدالحلیم اثر صاحب کا موقف یہ تھا کہ پٹھان بنی اسرائیل بھی ہیں، پشتون بھی اور آرین بھی۔ کسی ایسے مسئلے میں افکار و تحقیقات پر صرف ایک مجلس میں مقالات سن کر فوراً فیصلہ کر دینا کہ کیا حق ہے اور کیا ناحق، ممکن نہیں ہوتا اور اگر کوئی فیصلہ کر بھی دیا جائے تو اس کی صحت محل نظر رہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صدر مذاکرہ پروفیسر سید تقویم الحق کاکاخیل صاحب نے اس قسم کا عاجلانہ فیصلہ کر دینے سے گریز کیا۔

یہاں ان افکار و تحقیقات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ مسلم اور غیر مسلم مورخین اور محققین کے اعتراف و تحقیق کے مطابق آریہ تو خود کسی ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ مسلّمہ طور پر وہ ایک "کلچرل گروپ" ہیں۔ ایسی صورت میں اس نظریے کو کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ پٹھانوں کا نسلی تعلق آریوں سے ہے۔ رہا یہ موقف کہ پٹھان بنی اسرائیل بھی ہیں اور آرین بھی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے، اس موقف کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ پٹھان خود ایک "نسلی وحدت" کے بجائے ایک کلچرل گروپ ہیں۔ لیکن کیا پٹھانوں کی تاریخ کے مسلسل اور غیر مشتبہ واقعات سے آنکھیں بند کر کے اس موقف کو تسلیم کرنے کی کوئی حقیقت پسند جرأت کر سکتا ہے؟

اس مذاکرہ میں روشن خان نے پٹھانوں کے بنی اسرائیل ہونے کے نظریے پر اپنی تحقیقات پیش کیں۔ چونکہ یہ کتابچہ خان صاحب کی انہی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی رائے دینے کے بجائے اس کا فیصلہ قارئین کے تاریخی ذوق پر چھوڑتے ہیں۔

اس موقع پر روشن خان نے یہ پیش کش کر کے سامعین کو بہت مسرور کیا کہ وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ تینوں مقالوں کو اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں الگ الگ دو کتابچوں میں چھاپ کر شائع کر دینے کا انتظام پشتو اکیڈیمی پشاور کر دے اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جائے۔ خان صاحب نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ اس انتظام کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب خاص سے برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ حاضرین نے خان صاحب کی اس پیش کش اور اعلان کا استقبال نہایت پرجوش تالیوں سے کیا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی روشن خان صاحب نے اپنا مقالہ اسی وقت [illegible] صاحب کے حوالے کر دیا لیکن دوسرے دونوں مقالہ نگاروں نے اپنے [illegible] مزید غور و فکر کرنے کے عذر پر اپنے مقالوں کو جناب [illegible] صاحب کے حوالے کرنے سے احتراز کیا۔ حاضرین خان صاحب موصوف کے اس

جرأت مندانہ اعلان دہش کش سے بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے اسی وقت تینوں مقالہ نگاروں کے اپنی اپنی تحقیقات اور نظریات پر ان کے اعتماد یا تذبذب کو بھی محسوس کر لیا۔

روشن خان صاحب نے صاحب صدر کی اجازت سے اپنے مقالے کی کچھ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں حاضرین میں تقسیم کر دی تھیں لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ مقالہ بڑے پیمانہ پر شائع ہو اور اردو اور پشتو دونوں زبانوں کے اہل علم، تاریخ کے شائقین خصوصاً پٹھانوں کی تاریخ کا ذوق رکھنے والے حضرات تک پہنچانے کا سروسامان کر دیا جائے۔ چنانچہ اس وقت بھی متعدد حضرات نے اس ضرورت کی طرف خان صاحب کی توجہ دلائی اور بعد میں بیشمار خطوط میں ان سے اس مقالے کی اشاعت کے لیے اصرار کیا لیکن انہیں انتظار تھا کہ دوسرے حضرات کے مقالے بھی موصول ہو جائیں اور ان کی اشاعت پشتو اکیڈیمی کے زیر اہتمام ہو لیکن اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی جب یہ امید بر آتی نظر نہ آئی تو انھیں اپنا یہ مقالہ شائع کر دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ لیکن اس کی شاعت میں ان کی اپنی خواہش سے زیادہ اصحاب ذوق کا اصرار شامل ہے

اب جب کہ صرف یہی مقالہ مستقل حیثیت میں شائع کیا جا رہا ہے خان صاحب نے بعض مقامات پر چند اہم اضافے بھی کر دیے ہیں اور آخر میں بھی بعض ضروری مباحث بڑھا دیے ہیں۔

امید ہے کہ اہل علم خصوصاً پٹھانوں کی تاریخ کے مطالعے کے شوقین اس مقالے کو پسند فرمائیں گے۔ وہ حضرات بھی جو بذات خود، ۱۱ اپریل ۱۹۸۱ء کے مذاکرہ میں اس مقالے کی سماعت کا لطف اٹھا چکے ہیں اور جنھوں نے اس مقالے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مطالعہ کی ہے۔ اس نظر ثانی و اضافہ شدہ حالت میں مقالہ کو زیادہ مفید اور دلچسپ پائیں گے۔ لیکن خان صاحب کے بقول ان کی آرزوؤں کا مرکز نئی نسل اور قوم کے نوجوان ہیں۔ کاش وہ ان افکار کی معنویت پر غور کریں اور انھیں سمجھیں۔ (پرویش شاہین)

افغانوں کی نسلی تاریخ

جناب صدر اور معزز حاضرین!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

انتہائی تحقیق اور جستجو کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بلاشک وشبہ پختون، پشتون، روہیلہ، سلیمانی، پٹھان اور افغان سب ایک ہی قوم کے مختلف نام ہیں اور یہ اُن گمشدہ اسرائیلیوں کی اولاد ہیں جنہیں اشوریوں اور بابل والوں نے باری باری شام کے علاقوں سے مشرق کی طرف جلاوطن کیا تھا اور جن کا ذکر کتاب مقدس اور کئی دیگر مشہور تاریخی کتابوں میں اکثر آتا ہے۔ افغان یا پختون کو آپ کسی بھی نام سے یاد کریں وہ اصلاً سامی ہیں اور ان کا تعلق ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو پہلے شریعت موسوی پر قائم تھی اور جب دعوت عیسوی کا ظہور ہوا تو انھوں نے اسے قبول کر لیا اور جب خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کی بدولت دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آخری سعادت ظاہر ہوئی اور حضورؐ نے اسلام کی دنیا کو دعوت دی تو قوم افغان آپ کی صدائے حق پر لبیک کہتے ہوئے مشرف بہ اسلام ہو گئی۔ اور دین اسلام کی تبلیغ میں کٹھن مراحل سے گذرتے ہوئے اُسے دنیا کے دور دراز ملکوں تک پہنچا دیا۔ کاش اس قوم کے نوجوان اس نکتہ کو سمجھ سکیں کہ یہ اس کی قومی خصوصیت اور ان کے بزرگوں کا تعامل ہے۔ یہ پختونوں کی روشن تاریخ ہے جو صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں۔ اس کی تاریخ کا ہر دور اور اس کے واقعات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

آریہ یا ہندوؤں کی قدیم تاریخ پر ایک نظر

ڈاکٹر گستاولی بان لکھتے ہیں کہ :-

"لفظ ہندو قومیت کے لحاظ سے کچھ معنی نہیں رکھتا۔"

اور پھر وہ "ہندوؤں میں تاریخ کی کمی" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ :-

"وہی تحقیق کی کمی ہے جس کی وجہ سے اُن ہزارہا جلدوں میں جو ہندوؤں نے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں، ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے۔ اُس زمانہ کے کسی واقعہ کو معیّن کرنے کے لئے ہمیں بالکل بیرونی چیزوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں میں ان کی عجیب خاصیت ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی نہایت مبیّن طور پر پائی جاتی ہے اور انسان کو اس خیال پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے۔" (تمدنِ ہند)

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آریاؤں کا تیسرا جتھا مشرق کی طرف چلا یہ لوگ راستہ کی تکلیفیں برداشت کر کے اپنے عیال و اطفال کے ہمراہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر پہنچے۔ عرصہ دراز تک دریائے سندھ پر رکے رہے۔ یہاں اس علاقے میں اس وقت کالی نسل کے لوگ یعنی کول اور دراوڑ آباد تھے۔ ایرانیوں نے چار ہزار سال قبل ان کا نام ہند رکھا تھا "ہند" ایرانیوں کے ہاں بمعنی سیاہ کالا تھا۔ جیسا کہ حافظ شمس الدین شیرازی کا ایک شعر ہے۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

کول اور دراوڑ کا مرکزی مقام انہیں کے سبب سے سیاہ یعنی ہند کے نام سے مشہور تھا۔ اور ہند کے قریب لاہور (لاہوار) بھی ان کا صدر مقام تھا۔ اور یہاں ان کی انتظامیہ رہا کرتی تھی۔ مقصد یہ کہ ہند (روئے ہند) اور لاہور (لاہوار) پشاور سے مشرق کی طرف ۵۶ میل یا ۱۴ فرسخ کے فاصلہ پر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع تھے۔ یہ دونوں شہر آریوں کی آمد سے قبل موجود تھے۔ آریوں کے یہاں پہنچتے ہی ان سے مڈبھیڑ ہوئی مختصر یہ کہ آریوں نے کول اور دراوڑ سے دریائے سندھ کے مغربی علاقہ پر جہاں ان کی بود و باش تھی، زبردستی قبضہ کر لیا اور ان کو پنجاب کی طرف جلاوطن کر دیا۔ آریوں نے کول اور دراوڑ کے شہر "ہند" اور لاہور کو بھی مرکزی مقام بنا لیا۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک عام بڑا شہر آریانا کے نام سے آباد کیا۔ جو اس موجودہ وقت میں آریان کہلاتا ہے۔ "ہند" نام شہر میں بادشاہ اور اس کے ارکان دولت کی رہائش گاہیں اور خصوصی مکانات تھے اور تحقیق علم کا مرکز بھی یہیں تھا اور یہ شہر قلعہ بند تھا۔ آریہ لوگ پہلے ماد، مادی، میدی اور میڈی کے ناموں سے پکارے جاتے تھے، جب یہ خراسان اور اس کے متعلقہ علاقوں میں آکر بس گئے تھے۔ قیاس یہ ہے کہ جلاوطن اسرائیلیوں نے ان کو آریہ نام دیا ہوگا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ لوگ آگ کے پجاری تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے ان کو آرین کے نام سے یاد کیا ہوگا۔ آرین کا مطلب آگ والے یا آگ کے پجاری ہے۔ ارین پشتو لفظ ہے۔ پشتو میں اَر بمعنی آگ اور لفظ "ن" نسبت کے لئے آتا ہے جیسا کہ پین۔ مالگین، رخاورین وغیرہ۔ معلوم رہے کہ اُر نام کا شہر حضرت ابراہیمؑ کا مسکن تھا، اس شہر میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی۔ اور اس شہر میں ہمیشہ

آر یعنی آگ جلنے کے سبب سے یہ آر کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ الغرض
آرین یعنی آگ کے پجاری جو ایک مذہبی نام معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جو لوگ
اس عقیدے کے قائل تھے۔ وہ آرین یا آریا پکارے گئے اور جب یہ آریہ
لوگ ہند (وے ہند) پہنچے اور یہاں سکونت اختیار کی۔ اور اس کے علاوہ
حکومت بھی بنائی۔ تو اسی "ہند" کی وجہ سے ہندو مشہور ہوئے۔ لفظ "و"
نسبت کے لئے ہے۔ یعنی ہند والے یا ہند کے باشندے۔ اس کا مطلب
یہ نکلتا ہے۔ کہ ہندو نام نہ نسب کی وجہ سے ہے اور نہ مذہب کی وجہ
سے ہے۔ بلکہ یہ ان کے مسکن "ہند" کی نسبت کے اظہار کے لئے آیا ہے
ہند میں طویل مدت تک قیام کی وجہ سے ان کا نام ہندو مشہور ہوگیا یہاں
انہوں نے کافی عرصہ بعد ہندی زبان بنائی۔ ہندی میں لفظ "ی" نسبت
کا ہے ہند کو یعنی "ہند" کی زبان۔ اگرچہ شروع میں یہ اقوام ایک
ہی زبان بولتی تھیں۔ جس کا نام اریک تھا۔ اور پھر انہوں نے سنسکرت
کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی "وید" نامی کتاب بھی یہیں بنائی گئی تھی۔ وید بھی
"وے ہند" کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔ یہاں انہوں نے اور بھی کئی کتابیں
تصنیف کیں۔ ان تصانیف میں پختون قوم کے علماء سے بہت مدد لی
گئی۔ ان علماء میں پنی (پنڑی) اور جلو کے نام خاص طور پر قابل ذکر
ہیں۔ اسی لاہور کے مغربی حصہ میں پنی (پنڑی) کی جائے رہائش کے
آثار اسی کے نام سے آج تک موجود ہیں اور اسی طرح ہنڈ میں بھی جلو
کے نام سے جلو ونڈ موسوم ہے۔ ہندوؤں کی ریاست جب "ہند" میں
مضبوط ہوئی۔ اور جتنے علاقے اس کے زیر اثر آئے۔ ان کا نام ہندوستان
ہوا یعنی ہند کی ریاست کا زیر اثر علاقہ۔ اس علاقے میں عرصہ دراز گذارنے
کے بعد دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب میں داخل ہوئے۔ دریائے سندھ
کا پشتو نام اباسین ہے۔ جو عبرانی نام دریائے آبانا کے مترادف ہے۔

پنجاب میں انہیں یہاں کے اصلی باشندوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن آریہ یہاں
کے اصلی باشندوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور فن جنگ میں ماہر تھے۔ آخر
فریق مخالف پر غالب آگئے۔ اور رفتہ رفتہ تمام موجودہ شمالی ہندوستان پر
قابض ہوگئے۔ بعد میں اسی علاقے کا نام بارت یا بھارت مشہور ہوا۔ قیاس
کیا جاتا ہے کہ بارت یا بھارت "عبرتا" سے ماخوذ ہے۔ "عبرتا" آرامی
زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ جائے عبور۔ مطلب یہ لیا جاتا ہے۔ کہ
جب ان لوگوں نے دریائے سندھ عبور کیا۔ تو بارتی کہلائے اور اس پار
علاقے کا نام بارت ہوا۔ یہ نام بھی اسرائیلیوں کا رکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں سے پہلے جو قوم رہتی تھی۔
وہ سیاہ یعنی کالے تھے۔ اور اسی سبب ان کے مرکزی مسکن کو ہند کہا جاتا
تھا۔ مگر آریہ سرخ سفید رنگ کے تھے۔ لیکن ان کالے لوگوں کے وارث
بننے کے سبب سے یہ بھی ہندو مشہور ہوئے۔ آریہ یعنی ماری یا میدی
لوگ اسرائیلی جلاوطنوں سے کافی عرصہ پہلے سارے ممالک خراسان اور اس
کے آس پاس کے علاقوں میں آباد تھے۔ اور نینوا کے اشوریوں کے ماتحت ایک
کمزور زندگی گذارتے تھے۔ پہاڑوں سے اترے ہوئے وحشی اور جاہل قسم
کے لوگ تھے۔ تعلیم وتمدن سے بے بہرہ تھے۔ ان میں نہ کوئی سیاسی
شعور تھا۔ اور نہ ان کی کوئی تنظیم یا حکومت تھی۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی
سمجھئے کہ اسرائیل جلاوطنوں کے جتھے در جتھے یکے بعد دیگرے ان کے
ہاں بسانے کے لئے اشوری بادشاہوں نے شام اور نینوا سے بھیجدیئے۔
واضح ہو کہ اسرائیلیہ کا پہلا جتھہ شاہ اشوری پال یا پلول کے ہاتھوں جلاوطن
ہوا تھا۔ یہ واقعہ سات سو اکہتر (۷۷۱) برس قبل مسیح پیش آیا تھا۔ ان
جلاوطنوں میں روبن اور جد کے دو قبیلے تھے۔ جد کی اولاد اس وقت تک
افغانستان میں آباد ہے اور جدرانی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

ان دنوں اسرائیلیہ کا بادشاہ ناحم تھا اور یہودا کا بادشاہ عزیا تھا۔ اس کے بعد بھی بنی اسرائیل کی جلاوطنی کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔ جو اس واقعہ سے ایک سو اسّی سال کے بعد بخت نصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی پہ ختم ہوا۔ اور ان اسرائیلی جلاوطنوں کی بدولت ۰۰، قبل مسیح کے بعد سے آریہ لوگوں میں لکھنے کا رواج بھی شروع ہوا۔ الغرض ان کے آنے سے میدیوں یعنی ان آریہ لوگوں کو بہت فائدے حاصل ہوئے کیونکہ اس وقت آریوں کی حالت خراب تھی۔ اس بارے میں فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤ لیبان کا بیان اس کی اپنی تصنیف "تمدن ہند" میں یوں درج ہے، کہ ان میں مطلق کسی قسم کے سیاسی نظامات یا ذات یا حکومت نہ تھی۔ ان کی معاشرت کی بنیاد خاندان پہ تھی۔ اور ساری قوم ایک تھی۔ اور اس میں بالکل مدارج نہ تھے۔ ہر ایک خاندان کا باپ خود ہی پروہت، کاشتکار اور سپاہی تھا۔ یہ مختلف پیشے جو آگے چل کر ذات کی تقسیم کے باعث ہوئے۔ اس وقت ملے جلے ہوئے تھے۔ رگ وید کے بڑے دیوتا اگنی آگ کا دیوتا ہے۔ "سوم" ملشی عرق ہے۔ جو اس کو تند کرتا ہے۔"

اور اس کے برعکس اسرائیلی جلاوطن تعلیم یافتہ ہنرمند حکماء نجومی طبیب اور ماہر نفسیات تھے۔ تمدن و معاشرت میں بہت آگے تھے۔ غرض یہ کہ جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے کہ ہر کام میں اسرائیلی جلاوطن ان کے استاد بنے۔ اور نیز ان مقامی لوگوں کو زندگی گذارنے کے اچھے طریقے سکھائے اور نظم و ضبط سے بھی واقف کرایا۔ اسرائیلیوں نے جہاں اپنے ملک شام کی طرح کوئی چیز یعنی دریا، پہاڑ، گاؤں، ندی نالہ اور علاقہ دیکھا تو اس کا وہی شامی نام رکھا۔ سیاست میں بھی ان جلاوطنوں کو بڑا دخل تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میدیوں اور پھر خورس کی سلطنت بننے میں انہی کا ہاتھ تھا۔ اشوریوں اور پھر بابلیوں سے انتقام لینے کے جذبات بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں

ان کو ایک گونہ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی جیسا کہ قصص القرآن جلد سوم ص ۱۰۱ میں درج ہے:۔

"بابلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا۔ جبکہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا۔ خورس نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور ان کو اطمینان دلایا۔ کہ وہ اپنی مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پہ حملہ کرے گا۔ اور ان کو بابل کے ظالم اور عیاش بادشاہ سے نجات دلائے گا۔ خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہوگیا۔ تو حسب وعدہ اس نے بابل پہ حملہ کر دیا۔"

اسرائیلی تو اپنے آپ ہر فن مولا تھے۔ میدی یعنی آریا لوگ ہمیشہ ان کے محتاج رہتے۔ اس کے علاوہ ہخامنشی خاندان کے عہد سلطنت میں جو دو سو بیس[۲۲۰] سال سے مستحکم اور مضبوطی سے قائم تھا۔ اسرائیلی حاکم قوم کی شکل میں تھے۔ اس وجہ سے ان کی ہر بات میں وزن تھا۔ اور جو نام رکھتے اسے قبول عام ہوتا اور جو وہ بولتے رواج پاتا ان کی ہی زبان سے آریہ لوگوں نے بہت الفاظ سیکھے۔ اور ہر کام میں ان سے امداد لی۔ اور سبق حاصل کئے۔ اسرائیلی قوم اور ان کے انبیاء اس علاقے میں دینی تبلیغ اور راہنمائی کرتے۔ علم و فضل کے مالک تھے۔ کمی صرف یہ تھی۔ کہ اپنے ملک سے جلاوطن تھے۔ اور منتشر حالت میں آباد تھے۔ پھر بھی ان کی فضیلت اپنی جگہ قائم تھی۔ اور انھیں علمی اخلاقی برتری حاصل تھی۔ مثال کے طور پہ اگر کوئی وکیل، قاضی، عالم، حکیم، ماہر فن یا کوئی ہنرمند شخص بادشاہ وقت کے قانون کی خلاف ورزی کے سبب جیل خانہ میں چلا جاوے تو ان کا علم و ہنر جیل کے دروازے پہ نہیں رہ جاتا۔ بلکہ وہ علم و ہنر وغیرہ اس کے ساتھ جیل کے اندر ضرور جائے گا۔ لہٰذا اسرائیلی خدا سے نافرمانی کے جرم میں تباہ و برباد ہوئے۔ اور غلامی کے سزاوار بن گئے لیکن ان کی سمجھداری اور علم و ہنر اس حالت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے متعلق

قرآن کریم کا ارشاد ہے ولَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ط (سورۂ دخان)
"اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے ان کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے"
معلوم رہے ۔ کہ ہند کا نام آج کل پشتو زبان میں انڈ اور ہنڈ زیادہ استعمال ہوتا ہے اور انگریزی میں بھی انڈ بولا جاتا ہے ۔ اس وقت سارے ہندوستان کو انڈیا اور اس کے باشندوں کو انڈین کہتے ہیں ۔ مگر گذشتہ دور میں یہ نام محدود تھا

آریہ نسل کی کوئی حقیقت نہیں

اس سلسلہ میں ایک نامور مورخ محمد مجیب مرحوم (بی ۔ اے آکسن پروفیسر تاریخ وسیاست جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اپنی تالیف "تاریخ تمدن ہند" (عہد قدیم) (مطبوعہ ۱۹۵۱ء عثمانیہ یونیورسٹی پریس حیدرآباد دکن) میں تفصیل کے ساتھ آریوں کی نسل، زبان، مذہب اور ہندوستان میں ان کے آنے کی تاریخ اور آریہ نام کی بحث کی ہے اور تاریخ کی نہایت مفید معلومات پیش کی ہیں ۔ میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ان کی تحقیقات سے چند ضروری اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں آریوں کی نسل کے متعلق محمد مجیب مرحوم لکھتے ہیں ۔

"یورپ میں سنسکرت کا مطالعہ شروع ہوا اور اس کا پتہ چلا کہ سنسکرت، ایرانی، لاطینی ۔ یونانی اور جرمن زبانیں ایک اصل سے ہیں ۔ تو ہند جرمانی یا ہند یورپی زبان اور تہذیب اور اس تہذیب کو پھیلانے والی آریہ نسل کا تصور قائم ہوا ۔ اصل میں یہ تصور بے بنیاد تھا ۔ آریہ نسل کی کوئی حقیقت نہیں ۔ وہ جسمانی خصوصیات جو آریہ نسل کی پہچان مانی جاتی ہیں ۔ ان قوموں میں جو اپنے آپ کو آریہ کہتی ہیں اس کثرت سے نہیں پائی جاتی ہیں کہ ان کے آریہ ہونے کا دعوے تسلیم کر لیا جائے لیکن قومیت کے پرستاروں نے اس عقیدت کے ساتھ آریہ نسل کے گن گائے کہ

ایک دنیا دھوکے میں پڑ گئی ۔ نسل کا لفظ اب اس قدر رائج ہو گیا ہے، ہے کہ غلط فہمی کے اندیشوں کے باوجود اسے ترک کرنا مشکل ہے"
(صفحہ ۱۹)

"آریوں کے مذہب میں آگ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور آریوں میں مورتوں (بتوں) کی پوجا کا رواج نہ تھا" (صفحہ ۵۳)

سنسکرت زبان کے متعلق ایک مختصر اشارہ تو اوپر کے اقتباس میں آچکا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں

"سنسکرت ابجد کے دندانی حروف ٹ وغیرہ اور کسی ہند جرمانی زبان میں نہیں ملتے ۔ سنسکرت کے بہت سے الفاظ کا مادہ آریائی نہیں معلوم ہوتا ۔" (صفحہ ۵۴)

آگے چل کر آریہ نسل' ان کے وطن اور ان کی زبان کے بارے میں مزید حقائق کو روشنی میں لاتے ہیں اور فرماتے ہیں :-

"آریہ در اصل کسی نسل کا نام نہیں ہے ۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ ہم اس لفظ کو بالکل چھوڑ دیتے ۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اپنے آپ کو ہندوستان میں آکر "آریہ" کہنے لگے ۔ کوئی اور نام تجویز کر لیتے مگر یہ اصطلاح اس قدر رائج ہو گئی ہے کہ اسے ترک نہیں کیا جا سکتا اس لئے اسی سے کام نکالنا پڑتا ہے ۔ غلط فہمی سے بچنے کی یہ صورت ہے کہ ہم یاد رکھیں کہ آریہ سب گورے اور قد آور نہیں تھے ۔ سب کی ناک اونچی بال سنہرے اور آنکھیں نیلی نہیں تھیں انہیں آریہ صرف اس بنا پر کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے آریوں کے اصل وطن کا پتہ چلانا مشکل ہے اب اکثر محقق اس پر متفق ہیں کہ آریہ نسل کا گہوارہ دریائے ڈینیوب کی وادی تھی ۔ یہاں سے اس کے قبیلے اِدھر اُدھر جاتے رہے ۔ وہ قبیلے جو ہندوستان پہنچے،

درہ دانیال سے گذر کر ایشیائے کوچک اور شمالی ایران ہوتے ہوئے آئے ۱۲۰۰ ق م کے لگ بھگ شمال ہندوستان میں آباد ہونے لگے تھے۔ زرتشتی مذہب کی مقدس کتاب ژند اوستا اور رگ وید کی زبان میں اتنا کم فرق ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ آریہ کے ہندوستان آنے اور رگ وید کے مرتب ہونے کے درمیان بہت لمبا عرصہ نہ گذرا ہوگا۔ (صفحہ ۵۵)

آریوں کی زبانوں اور ان کے رسم الخط کے بارے میں مجیب صاحب لکھتے ہیں:۔

"ساتویں صدی ق م کے بعد سے ان میں لکھنے کا رواج بھی آہستہ آہستہ شروع ہوا۔ اشوک کے کتبات یا تو کھروشتی (خروشتی) رسم خط میں ہیں جو مشرقی افغانستان اور پنجاب میں رائج تھا۔ یا براہمی رسم خط میں ہیں۔ کھروشتی (خروشتی) ایک قدیم آرمی رسم خط سے اخذ کیا گیا ہے جو پانچ سو ق م میں رائج تھا۔ یہ دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا آریوں نے اس رسم خط کی علامتوں کو اپنی زبان کی اصوات اور حروف میں تبدیل کر لیا۔ براہمی ابجد کے چھیالیس حروف کی شکلیں معین کی گئیں اور اسے دائیں سے بائیں طرف کے بجائے بائیں سے دائیں طرف لکھنے کا قاعدہ بنا۔ غالباً پانچ سو ق م تک براہمی ابجد مکمل ہو گئی تھی۔ پانی نی (رشی) نے جس کا زمانہ چوتھی صدی ق م تھا اس کو صحیح مانا ہے۔ اس زمانے میں یا اس کے کچھ بعد براہمی رسم خط کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک شمالی دوسری جنوبی۔ پانی نی (رشی) کے قواعد نے رسم خط کے ساتھ زبان کو بھی ایک معیاری شکل دیدی۔ اور جو کام کئی سو برس سے آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ اس کی تکمیل کر دی یہیں سے ویدی زبان کا سلسلہ ختم اور سنسکرت کا شروع ہوتا ہے۔ بول چال کی زبانیں اس کے بعد بھی رہیں۔ اور ان کو کچھ نہ کچھ ترقی بھی

ہوتی رہی۔ لیکن پڑھے لکھے شائستہ لوگوں کی زبان سنسکرت تھی"۔ (صفحہ: ۵۷)

رگ وید اور سام وید کی تالیف و تدوین کے بارے میں انہوں نے ان حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

"آریوں نے شمال مغربی ہندوستان (یعنی ہند) میں آباد ہونے کے بعد تمام بھجن یکجا کر لئے۔ اور اس مجموعے کا نام رگ وید رکھا۔ رگ وید ہند جرمانی تہذیب کی سب سے پرانی یادگار ہے۔ اور اس کی ادبی خوبیوں کو دیکھیے تو ایک کرشمہ سے کم نہیں۔ رگ وید کے بھجن اس وقت گائے جاتے جب پوجا کے لئے آگ جلائی جاتی یا سوم کے پودے کا رس نکالا جاتا۔ اس سے شراب بنتی تھی جس کا پینا عبادت میں داخل تھا۔ اور اسے آریہ پسند بھی کرتے تھے۔ رگ وید مرتب ہو گیا تو اس کے وہ بھجن جن میں سوم کو مخاطب کیا گیا تھا الگ کر کے ایک نیا مجموعہ تیار کیا گیا جو سام وید کہلاتا ہے"۔ (صفحہ: ۵۸)

شادی کی رسوم و طریق کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

۱۔ "آریوں کی خاندانی رسمیں مثلاً گھر کے ایک مرکزی مقام پر ہر وقت آگ جلتی رکھنا اور دولہا دلہن کا اس آگ کے گرد چکر لگانا۔ (صفحہ ۷۰)

۲۔ "عورتیں بس گھر میں پوجا کی آگ جلتی رکھتیں۔ اور چڑھاوے اور نذر کے لئے ضروری سامان مہیا کرتیں"۔ (صفحہ: ۷۱)

۳۔ "دولہا کے ساتھ برات ضرور آتی۔ دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیا جاتا۔ دونوں پوجا کی آگ کے گرد طواف کرتے"۔ (صفحہ ۷۲)

آریوں یا ہندوؤں کے تہذیبی اور سماجی نظام کے بارے میں مجیب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت اہم اور توجہ طلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۔ ہندو مذہب عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ زندگی کا ایک نظام ہے۔
اور جو شخص اس نظام کو قبول کرے وہ عقائد میں آزادی کے ساتھ
انتخاب کر سکتا ہے۔" (صفحہ ۲۴۱)

۲۔ اس نئے دور میں مذہبی اتحاد پسندی نے ہر فرقے اور نسل کو جس
نے ہندو نظام زندگی کو قبول کیا سماج اور مذہب میں داخل کر
لیا۔" (صفحہ ۲۴۲)

یہ فکر انگیز اور بصیرت افروز تحقیقات پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن (ریٹائرڈ پروفیسر تاریخ و سیاست جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کی تھیں۔ یہی بات پروفیسر مکس میولر نے لکھی ہے۔ ان کے نزدیک "یہ آریا یا جیسا کہ ہم اس وقت انہیں آرین پکارتے ہیں ایک کلچرل گروپ تھا۔" (احمد چاگلا بحوالہ یوسفی)

آریوں کی تاریخ کے چند اہم پہلو

آریہ ہندوستان میں کب اور کہاں سے آئے؟ ان میں سے ایک بات پر بھی مورخین کا اتفاق نہیں۔ مشہور ہندو مورخ تارا چند پرنسپل کائستھ پاٹھ شالہ یونیورسٹی کالج الہ آباد (ہند) لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں آریہ قبائل کی آبادکاری اور آریہ ثقافت کے پھیلاؤ اور غیر آریوں کے خلاف ان کی جنگوں کی تفصیلات لکھی ہوئی تاریخ کا حصہ نہیں۔ اس لئے انھیں ہندوستان کی تاریخ کے ویدی دور سے ملانا ممکن نہیں البتہ محققین نے ویدی دور کے ادب اور "پرانوں" سے بعض واقعات اخذ کر کے سلسلۂ تاریخ کی کڑیاں ملانے اور ایک مربوط تاریخ بنانے کی کوشش کی ہے۔"[1]

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی کوشش قابل اعتماد اور مستند تاریخ کو جنم نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اصل وطن اور تاریخ اخراج وطن پر محققین کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ جب صورت حال یہ ہو تو کیوں کر پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اصل وطن سے نکلے کیوں تھے؟ مناسب ہوگا کہ آریوں کی تاریخ کے ان اہم پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۔ ہندوستان میں آریوں کی آمد کی تاریخ کے باب میں مورخین کی آرا میں نہ صرف دہائیوں کا بلکہ صدیوں کا فرق ہے۔ تارا چند نے ہندوستان میں ان کی آمد کا زمانہ دو ہزار برس سے لے کر ڈھائی ہزار برس (قبل مسیح) تک بتایا ہے۔

۲۔ آریوں کے اصل وطن کے بارے میں مورخین اور محققین کے دعاوی تارا چند نے اپنی مختصر تاریخ ہند میں نقل کر دیئے ہیں۔ ان پہ ایک نظر ڈال لیجئے۔ ان کے بیان کی دفعہ وار ترتیب یہ بنتی ہے۔

(الف) بعض کا بیان ہے کہ وہ ڈینیوب کی وادی میں رہتے تھے۔
(ب) بعض مورخین کے خیال میں وہ ہنگری اور یوکرینیا کے میدانوں سے آئے تھے جو ان کا اصل وطن تھا۔
(ج) بعض کے خیال کے مطابق ان کا اصل وطن قطبی (شمالی) علاقہ تھا۔
(د) بعض کی رائے ہے کہ وہ وسطی ایشیا کے باشندے تھے جہاں سے ترک سکونت کر کے وہ ہندوستان میں وارد ہوئے۔
(ہ) کچھ مورخین کا تو یہ دعویٰ ہے کہ آریہ ہندوستان میں کہیں باہر سے نہیں آئے بلکہ وہ شروع ہی سے ہندوستان کے باشندے تھے۔

تارا چند نے صرف اس بات پہ مورخین کا اتفاق بیان کیا ہے کہ آریہ ارال (جھیل) سے بحر اسود تک اور شمالی قطبی علاقوں تک پھیلے ہوئے گھاس کے وسیع میدانوں میں آباد تھے جو زراعت کے لئے نہایت مناسب ہیں۔[2]

---

[1] اے شارٹ ہسٹری ... مطبوعہ میکملن اینڈ کو لمیٹڈ لنڈن ۱۹۳۶ء ص ۲۶
[2] اے شارٹ ہسٹری آف دی انڈین پیپل مطبوعہ میکملن اینڈ کو لمیٹڈ لنڈن ۱۹۳۶ء ص ۲۵

آریوں کی تاریخ کے چند اہم پہلو کے ذیل میں تارا چند کے حوالے سے جو کچھ عرض کیا ہے ان کا اپنا بیان ہے جسے اردو کا جامہ زیبا پہنا دیا گیا ہے لیکن بعض طبیعتیں شاید اس سے مطمئن نہ ہوں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اطمینان کے لئے تارا چند کی تاریخ کے متعلقہ صفحات کے عکس کو پیش کر دیا جائے۔ ان کی اصل عبارت اور اس کا عکس یہ ہے۔

(a). The Aryan Migrations.

The Aryan People.—Before the Aryans entered India the country was peopled by a mixture of races. Among them were the primitive Negritoes, who ranked low in society, and were compelled to do dirty and mean work. They were the descendants of the earliest inhabitants of the country. Above them were the more advanced Kols (Australoids), and the civilised Dravidians. They were distributed among many independent tribes that lived in those parts of the country which had been made habitable by the cutting and burning down of forests.

The Home of the Aryans.—The Aryans arrived in India from the north-west. Historians are not agreed with regard to their original dwelling place. According to some they lived in the Danube valley, according to others in the plains of Hungary and Bohemia. Some believe that the Arctic region was their original home; others Central Asia. Some scholars think that the Aryans were not invaders at all, but were the inhabitants of India from the beginning. On the whole it appears most likely that they lived originally in the steppes stretching along the northern shores of the inland seas from the Aral to the Black Sea, a temperate grass-land region fit for the habitation of a pastoral and nomadic race acquainted with agriculture.

The Character of Migrations.—The Aryans, who emigrated from their original home, came in successive waves to India. They crossed over the passes of the Hindukush into Afghanistan, and entered India through the valleys of the Swat, the Kabul, the Kurram and the

Gomal rivers. They did not come as an invading army consisting of warriors only, but as settlers with their families, herds of cattle and carts laden with their goods. They were divided into a number of tribes and classes, and they occupied the lands of the north-west. In some cases the Dravido-Kolarian inhabitants adopted the Aryan language, religion and culture, accepted their *Rishis* as priests, and became their allies; in others they were dispossessed of their power and made subjects of the Aryans, and in still others the higher classes were driven out and forced to migrate, and the Aryans became masters of their territories.

History of Settlements.—The history of the settlement of various Aryan tribes who came to India from time to time and spread the Aryan culture, and of the wars which the Aryans waged against the non-Aryans and among themselves has not been recorded, and it is impossible to give a connected account of the events of the Vedic Age. Scholars have, however, tried to collect facts scattered in the Vedic literature and *Puranas*, and attempted to build up some sort of a connected narrative out of the legends and traditions.

۳۔ آریوں کی زبان کے بارے میں تارا چند کا بیان یہ ہے :-

"ان کی زبان جس کا رشتہ قدیم یورپین زبانوں میں سے یونانی اور لاطینی زبانوں سے تھا ... انڈو یورپین یا ہند جرمانی زبان کہلاتی تھی۔"[۱]

زبان کے متعلق تارا چند کا مکمل بیان یہ ہے

They spoke a language which is connected with the ancient European languages like Greek and Latin, modern European languages like English, German, French and Russian, Eastern languages like Persian and the Indian Vedic Sanskrit and its branches, the modern languages of Northern India like Hindi, Urdu, Punjabi, Bengali, Gujarati and Marathi. To the parent language the name Indo-European or Indo-Germanic has been applied.

۱؎ ایضاً صفحہ ۳۰۔

آریوں کی تاریخ کے بہ پہلو پٹھانوں (بنی اسرائیل) کی تاریخ سے اتنے مختلف ہیں کہ دونوں کو ایک نسل سے قرار دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پٹھانوں کی تاریخ کا قدیم سے قدیم واقعہ بھی تاریخ کی روشنی میں ہے اور بعد کی تاریخ کے ساتھ مربوط و مسلسل ہے۔ پٹھانوں (بنی اسرائیل) کی تاریخ لکھنے کے لئے مورخ کو "قیاس و رائے سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ان کے اصل و قدیم وطن اور بعد کے ادوار میں ان کے قیام و سکونت کا ایک ایک مقام تاریخ نے اپنے حافظے میں محفوظ رکھا ہے اور آج بھی دنیا کے نقشے پر ان کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ ان کی اصل وطن سے جلاوطنی یا اخراج کے واقعات اور ان کی حیات قومی کے حوادث اور ان کا پورا پس منظر ماہ و سال کے شمار کے ساتھ تاریخ کی روشنی میں ہے اور اس میں اور آریوں کی تاریخ میں ادنیٰ مماثلت اور مشابہت نظر نہیں آتی۔ پٹھانوں کی قومی زبان اپنے ماخذ اور اصل کے لحاظ سے آریوں کی زبان کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتی۔

تارا چند نے انڈو یورپین یا ہند جرمانی زبان کے اثرات جدید یورپی زبانوں سے لے کر مشرقی زبانوں میں فارسی، سنسکرت اور ہندوستان کی جدید زبانوں میں ہندی، اردو، پنجابی، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی تک پر بتائے ہیں لیکن انھوں نے نہ قدیم زبانوں میں آرامی، عبرانی کا نام لیا اور نہ جدید زبانوں میں اس خاندان کی زبان "پشتو" سے اس کا رشتہ جوڑا اور نہ اس پر ہند جرمانی زبان کے اثرات کی نشان دہی کی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ پشتو نہ ہند جرمانی زبان سے پیدا ہوئی نہ اس سے رشتہ جوڑا۔

پروفیسر سید محمد سلیم نے آریائی زبانوں کے خاندان اور سامی زبانوں کے خاندان کا جس سے پشتو زبان کا رشتہ ہے، فرق بالکل واضح کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"آریائی خاندان السنہ سامی خاندان السنہ سے بالکل مختلف ہے
بہت سی سامی آوازیں ایسی ہیں جو آریائی زبانوں میں نہیں پائی جاتیں"[1]

[1] اردو رسم الخط از پروفیسر سید محمد سلیم، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء صفحہ ۴۷

اوپر گزر چکا ہے کہ آریوں کے بارے میں محققین اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ وہ بیرون ہند سے آنے والی ایک غیر ہندی قوم ہیں یا ہندوستان ہی کے قدیم باشندے ہیں، جب کہ بنی اسرائیل (یعنی پٹھانوں) کے اپنے اصل وطن سے نکلنے یا نکالے جانے سے لے کر ورود ہند تک کی مدت کے صبح و شام اور مسافت کی ایک ایک منزل گنی جا سکتی ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی پٹھانوں کو آریائی قرار دیتا ہے تو یہ ایک صریح ظلم ہے۔

ایک اہم نکتے کا اعادہ

جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کوئی معمولی بات نہیں تاریخ کا بہت اہم نکتہ ہے۔ آریوں کے قومی وطن اور ہندوستان میں ان کی آمد کے صحیح زمانے اور تاریخ کے بارے میں، ان کے بیرونی قوم یا ہندی النسل ہونے کے بارے میں آج تک تمام غیر مسلم مورخ بھی اتفاق نہیں کر سکے اور پٹھانوں کے قومی وطن، ان کی جلاوطنی کے حوادث، دنیا میں ان کے پھیلاؤ، ہندوستان میں ان کی آمد، ان کے قیام و سکونت کے مقامات اور ان کی تاریخ و روایات کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوا۔ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں، الگ الگ بہنے والے دو دریا ہیں، دونوں کے الگ الگ میدان اور جدا جدا راستے ہیں۔ دو الگ الگ تاریخیں اور روایتیں ہیں۔ دونوں کی زبان، مذہب اور ثقافت جدا جدا ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ پھر پٹھان یا افغان آریہ نسل سے کیونکر ہو سکتے ہیں۔

افغانوں اور آریوں میں حد فاصل

جو کچھ عرض کیا ہے محض ظن و تخمین نہیں، تاریخی حقائق ہیں جو بار بار زبان قلم پر آ جاتے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ آریہ نسل کے قبائل اور سامی نسل کے قبائل، جنھیں ہم بیان کی سہولت کے لئے افغان یا پٹھان کے نام سے پکارتے ہیں، کا مخرج بالکل الگ الگ ہے۔ دونوں کا انشعاب اور پھیلاؤ

الگ الگ سمتوں میں رہا ہے خصوصاً سامی نسل (افغانوں) کے شعوب و قبائل کی جگہ و دو کے میدان اور ان کے قدیم و جدید قبائل کی نشاندہی کر دی ہے اور آخر میں جدید اثری تحقیقات کے حوالے سے بنی اسرائیل یا سامی نسل یا افغانوں کے سب سے بڑے مذہبی امتیاز اور شرف کو واضح کر دیا ہے کہ ان میں قدیم زمانے سے ایک اَن دیکھے خدا کی ہستی کا اعتقاد موجود تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

"سامی قبائل کا اصلی سرچشمہ صحرائے عرب کے بعض شاداب علاقے تھے، جب اس چشمے میں نسل انسانی کا پانی بہت بڑھ جاتا تو اطراف میں پھیلنے لگتا، یعنی قبائل کے جتھے عرب سے نکل کر اطراف و جوانب کے ملکوں میں منتشر ہونے لگتے اور پھر چند صدیوں کے بعد نیا رنگ روپ اور نئے نام اختیار کر لیتے۔

• شاید انسانی قبائل کا انشعاب کرۂ ارضی کے دو مختلف حصوں میں بیک وقت جاری رہا اور زمانہ مابعد کی مختلف قوموں اور تمدنوں کا بنیادی مبدا بنا۔ صحرائے گوبی کے سرچشمے سے وہ قبائل نکلے جو ہندی یورپی (انڈو یورپین) آریاؤں کے نام سے پکارے گئے۔ صحرائے عرب سے وہ قبائل نکلے جن کا پہلا نام سامی پڑا اور پھر یہ نام بے شمار ناموں کے ہجوم میں گم ہو گیا..."

۱؎ واضح رہے کہ عرب سے مراد صرف وہی علاقہ نہیں ہے جو آج کل سعودی عربیہ کہلاتا ہے بلکہ قدیم جغرافیہ والوں نے ان تمام ملکوں کو عرب کا نام دیا ہے جو آج کل تاریخ میں مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں اور نقشے میں مختلف رنگوں میں دکھائے جاتے ہیں۔ خصوصاً مصر، شام، فلسطین، اردن وغیرہ کا وہ علاقہ جسے سرزمین بنی اسرائیل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ عرب میں شامل تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب" از مولانا ابو الکلام آزاد۔

بنی اسرائیل کا اہم امتیاز

اس سلسلہ بیان میں مولانا آزاد نے بنی اسرائیل کے اہم مذہبی امتیاز پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

"عرب قبائل کا یہ انشعاب بتدریج مغربی ایشیا اور قریبی افریقہ کے تمام دور دراز حصوں تک پھیل گیا تھا۔ فلسطین، شام، مصر، نوبیا، عراق اور سواحل خلیج فارس سب ان کے دائرہ انشعاب میں آگئے تھے۔ عاد، ثمود، عمالقہ، ہکسوس، موابی، آشوری، اکادی، سومیری، عیلامی، آرامی اور عبرانی وغیرہم مختلف مقاموں اور مختلف عہدوں کی قوموں کے نام ہیں، مگر دراصل سب ایک ہی قبائل کے سرچشمے سے نکلے ہوئے ہیں۔ یعنی عرب سے۔

اب جدید سامی اثریات کے مطالعے سے جو ان تمام قوموں سے تعلق رکھتی ہیں، ایک حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے یعنی ان تمام قوموں میں ایک اَن دیکھے خدا کی ہستی کا اعتقاد موجود تھا اور وہ "ال۔ الاہ" یا "اللہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی "الاہ" ہے جس نے کہیں "ایل" کی صورت اختیار کی، کہیں "اِلوہ" کی اور کہیں "الاہیا" کی۔ سرحد حجاز کی وادی عقبہ اور شمال شام کے پاس حجر کے جو آثار گذشتہ جنگ کے بعد منکشف ہوئے، ان سے یہ حقیقت اور زیادہ آشکارا ہو گئی ہے۔۱؎"

ان حوالہ جات کے مطالعے سے اب یہ بات ہر لحاظ اور ہر جہت سے واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آریہ اور افغان اپنی نسل و خون، اپنے وطن، اپنی زبان، اپنے مذہبی اعتقادات، اپنی ثقافت (کلچر)، تہذیب، اپنے ذوق و مزاج، اپنی نفسیات اور معاشرتی زندگی کے اپنے پورے نظام میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور دونوں میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔

۱؎ ترجمان القرآن (جلد اول) ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، اشاعت سنہ ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۴۷-۲۴۶

آریہ ورت کا حدود اربعہ

ہندوستان پہنچ کر بھی دونوں قومیں اپنی زبان، تہذیب، مذہب، معاشرت اور اپنی تمام تاریخی و ثقافتی روایات میں ایک دوسری سے بالکل الگ اور مختلف رہی ہیں بلکہ ان کی سیاسی و معاشی تگ و دو کے میدان بھی الگ الگ رہے ہیں۔ آریہ ہندوستان میں خواہ کسی راستے سے پہنچے ہوں لیکن وہ بہت جلد شمالی مغربی علاقے سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے مشرقی کنارے سے لے کر مشرق میں برہم پتر کی وادی تک اور شمال میں کوہ ہمالیہ کی ترائی سے لے کر وندھیاچل کے دامن تک وسط ہند میں پھیل گئے۔ ہندوستان میں یہی علاقہ ان کی معاشی اور سیاسی تگ و دو کا میدان رہا اور ان کے نام کی نسبت سے "آریہ ورت" کہلایا۔ سوامی دیانند سرسوتی اپنی مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں آریہ ورت کا حدود اربعہ" کے زیر عنوان منوسمرتی (۲-۲۲) کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"مغرب میں سرسوتی یعنی دریائے اٹک[1] جو شمال کے پہاڑوں سے نکل کر جنوب کے سمندر (بحر ہند) میں جا ملتا ہے اور مشرق میں درشددتی یعنی دریائے برہم پتر جو نیپال کے مشرقی پہاڑ سے نکل کر بنگال اور آسام کے مشرق اور برما کے مغرب میں ہوتا ہوا جنوبی

---

[1] کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں دریائے سرسوتی یا ستلج کے کنارے اٹک واقع تھا شہنشاہ اکبر نے دریائے سندھ کے کنارے اسی اٹک کے نام سے قلعہ تعمیر کیا۔ جیسا کہ قبل ازیں اس کے پیش رو شیر شاہ نے ہندوستان والے رہتاس کے نام سے جہلم کے مغرب میں ایک قلعہ بنایا تھا لہٰذا یہاں اٹک سے مراد دریائے ستلج یا سرسوتی والا اٹک ہے، نہ کہ موجودہ دریائے سندھ والا جو ۱۵۸۱ء میں تعمیر ہوا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتا ہے:

"اکبر بادشاہ نے پنجاب سے ساحل سندھ کی طرف سفر کیا یہاں اس کا ارادہ ایک قلعہ بنانے کا تھا ... ۱۵ ار خرداد ۹۸۹ھ مطابق ۱۵۸۱ء کو اس نے ایک قلعہ کی بنیاد رکھی اور "اٹک بنارس" اس کا نام رکھا۔" (اقبال نامہ اکبری جلد ۳ ص ۱۳۴ تا ۱۳۹)

سمندر (خلیج بنگال) میں جا ملتا ہے۔ کوہ ہمالیہ کے وسط سے لے کر جنوب میں وندھیاچل (اور اس سے متصل مشرقی گھاٹ اور مغربی گھاٹ کے دونوں طرف) رامیشور تک جس قدر علاقہ ہے وہ تمام آریہ ورت کہلاتا ہے، کیونکہ اسے آریوں یعنی ارباب علم نے بسایا تھا۔ آریوں کا مقام رہائش ہونے کی وجہ سے یہ ملک آریہ ورت کہلاتا ہے"۔ ص ۲۲۲ اور یہی مصنف اسی کتاب کے صفحہ ۵۶ پر آریہ ورت کے حدود پھر واضح کرتا ہے:

"اس قطعہ کا نام ملک "آریہ ورت" اس لئے ہے۔ کہ اس میں ابتدائے پیدائش سے آریہ لوگ سکونت رکھتے ہیں۔ اس کے حدود شمالاً ہمالیہ، جنوباً وندھیاچل، غرباً اٹک اور شرقاً دریائے برہم پتر ہیں۔ ان چاروں کے درمیان جس قدر ملک ہے، اس کو "آریہ ورت" کہتے ہیں۔ اور جو ان میں ہمیشہ سے رہتے ہیں، ان کو بھی "آریہ" کہتے ہیں"

اسی صفحہ ۵۶ کے حاشیہ میں کتاب کے مترجم جگو پتی ایم۔ اے سوامی دیانند کی ایک اور کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"آریہ اُدیش رتن مالا میں سوامی جی نے لکھا ہے۔ کہ جہاں تک ان چاروں کا وستار ہے اور ان کے درمیان جو ملک ہے۔ اس کا نام "آریہ ورت" ہے۔ مطلب یہ کہ ان دریاؤں کے پھیلاؤ میں جو لوگ رہتے ہیں یا جو لوگ ہمالیہ اور بندھیاچل پہاڑوں میں ہمیشہ سے آباد ہیں، وہ بھی آریہ شمار ہوتے ہیں"۔

اس مقام پر ویدی اور بدھ عہد کے ہندوستان کا ایک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے جس کے مطالعے سے "آریہ ورت" کے حدود اربعہ کا نہ صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ یہاں اس نکتے کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ "آریہ ورت" یا قدیم ہندوستان میں شمال مغرب اور جنوب کے وہ علاقے شامل نہیں تھے جو بعد میں مسلم اکثریت کے علاقے بنے اور ۱۹۴۷ء میں ملک کو آزادی

ویدی اور بدھ دور کے ہندوستان کا نقشہ
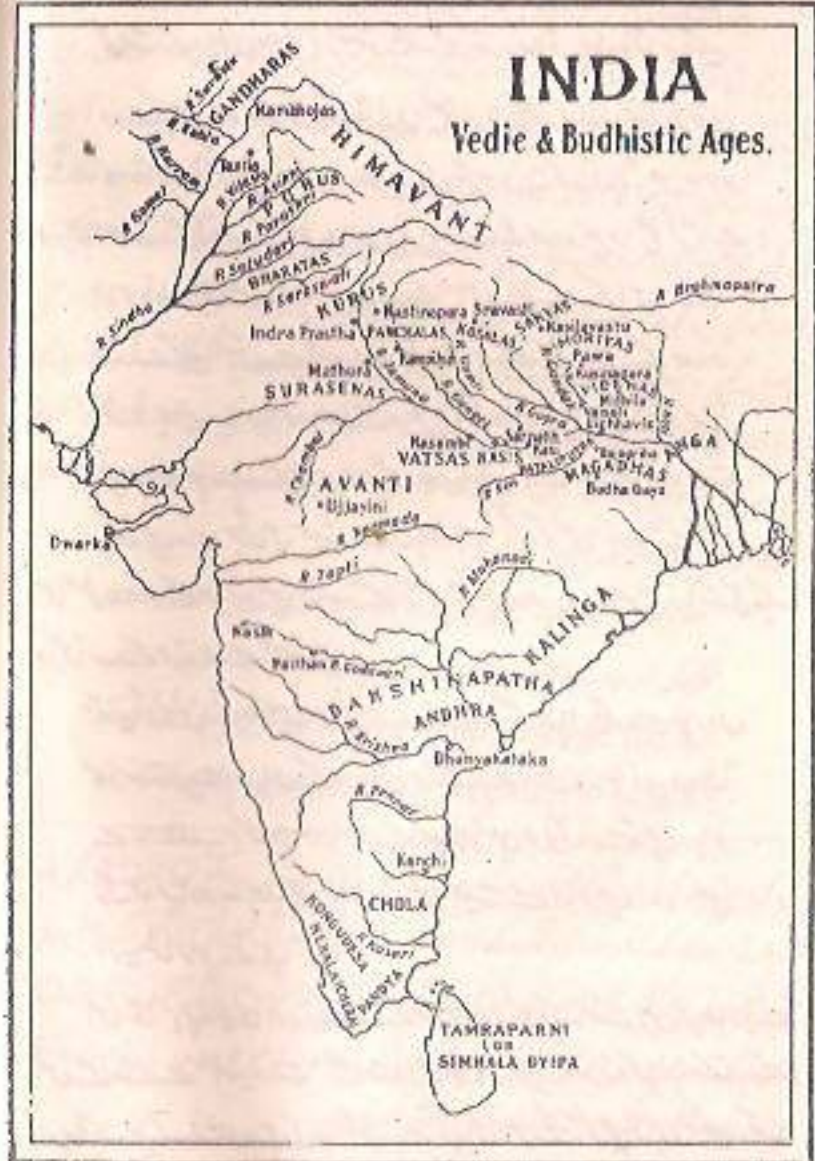
ویدی دور کا یہ ہندی شعر جسے اکبر بادشاہ نے راجہ مان سنگھ کو لکھ کر بھیجا تھا، قابل غور ہے؛
سب بھوم ہے گوپال کا جس میں اٹک کہا۔ جس کا من میں اٹک ہے سوئی اٹک رہے گا

(اقبال نامہ اکبری جلد ۵ صفحہ ۸۹۷)

ملنے کے بعد، پہلے مغربی اور مشرقی پاکستان کے ناموں سے دنیا کے نقشے پہ نمودار ہوئے اور آج پاکستان اور بنگلہ دیش کے ناموں سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

آریوں کے عقائد ان کی اپنی نظر میں

ہندوؤں کے عقائد وتعارف پہ آن کی اپنی تحریر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمانہ قدیم میں وہ بت پرست نہیں بلکہ آتش پرست تھے، اور ہندوستان میں آنے کے بعد بت پرست بنے تاتاری اور ساسانی نسل کے قدیم باشندوں کو وہ اپنا ہم نسل سمجھتے ہیں۔ البتہ افغان نسل کو اسرائیل کہہ کر ایک علیحدہ قوم تصور کرتے اور انہیں اسرائیل، پٹھان اور افغان قوم کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ نیز محمد غوری سے شیر شاہ تک کا زمانہ وہ افغانی دور سمجھتے ہیں۔ اس کی تصدیق میں تاریخ راجستھان جلد اول مترجمہ منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی (سنہ ۱۹۱۴ء) سے چند ضروری اور اہم اقتباسات کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ "قدیم شجروں میں ہندوؤں کا نام دیوتاؤں کے نام پر موجود نہ ہونے سے یہ باور کرنا خلاف عقل نہیں کہ بشنو مذہب کے قبل مورتی پوجا کا رواج نہ تھا۔ قدیم تواریخ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مقدس جنتر لوگ دیوں اور مورتیوں کا رواج کرشن چندر کے بعد ولایت کشمیر سے ہندوستان میں مروج ہوا۔ مورتی پوجا کی رفتہ رفتہ ایسی ترقی ہوئی کہ عوام الناس کل چیزوں کو پوجنے لگے۔ دیوتا تینتیس کروڑ ہو گئے۔ جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی ایسی باقی نہ رہی جس کی پرستش نہ کی گئی ہو۔ سورج سے لے کر چمار کی ماپی (رانپی) کو بھی لوگوں نے پوجنا شروع کر دیا۔ کرشن ایک

مگر یہ نقش سات صورتوں میں (کرشن جی کی مورتیں) راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں میں موجود ہیں"۔ (صفحہ: ۶۰۴)

۲۔ "اب سے بارہ سو برس پہلے سٹری رامچندر جی کے تخت حکومت پر ایک گھوڑ خوار (ایرانی) نے قدم رکھ کر ہندوؤں کے سورج کا خطاب حاصل کیا۔ وہ کبھی باور نہ کریں گے کہ دنیا کی قدیم ترین قوم کی موجودہ نسل یزدجرد بادشاہ خاندان ساسانی کے بقائے نام ہے۔ راجہ گروہا بھیل بہرام گور کا بیٹا تھا۔ جس کے ایک بیٹے کو چین کی حکومت حاصل تھی۔ ہم آگے چل کر رانا کے خاندان کا ایرانی نسل سے تعلق ظاہر کریں گے"۔ (صفحہ: ۴۵۶ و ۴۵۷)

۳۔ "اودے پور کے تاجدار تمام ہند کے فرمانرواؤں سے افضل و صاحب عظمت ہیں ہندوستان کے راجے تاجپوشی کی تقریب میں رانا اودے پور جا کے ہاتھ سے تلک کراتے اور اس رسم کے وقت ان کے سامنے سر ادب خم کرتے ہیں۔ تلک آدمی کے خون سے لگایا جاتا ہے۔ اودے پور کے فرمانرواؤں کا خطاب رانا ہے اور وہ اپنے کو نوشیرواں عادل کی اولاد سمجھتے ہیں۔ جس نے علاوہ اور ملک کے ولایت ہندوستان میں بھی علم فتح گاڑا۔ نوشیرواں کی زندگی میں نوشیزاد اس کا بیٹا جو شہزادی قیصر روم کے بطن سے تھا۔ عیسائی ہو گیا اور بہت سے رفقاء کو ساتھ لے کر ہندوستان میں قیام پذیر ہوا۔ اس کی اولاد ہندوستان میں باقی رہ گئی۔ اودے پور کے رانا کو اس کی نسل سے تعلق ہے"۔ (صفحہ: ۴۵۹)

۴۔ چونکہ دہلی کے تاتاری شہنشاہ کو لڑکیاں دینا ہندوؤں کے ہاں

ایک بدنما دھبہ تھا۔ لہذا انہوں نے داغ بدنامی سے بچنے کے لئے یہ بات پیدا کی کہ گو سلسلہ حسب و نسب بہت پرانا اور رشتہ بہت دور کا ہے۔ تاہم ہمارے اور تاتاری بادشاہ کے بزرگ ایک ہی تھے آخر میں اس خیال نے ان کے دل کو قدرے مطمئن کر دیا کہ آمیزش خون بزرگان قدیم کے خون ہی سے ہے"۔ (صفحہ: ۴۵۸)

۵۔ "محمود غزنوی کی یورشوں اور خاندان افغان (محمد غوری) کے حملہ اول کے موقعوں پہ اس دیوتا (کرشن جی کا بت) کو برج چھوڑنا پڑا غیر متعصب شاہان مغلیہ نے مذہب ہندو سے مخالفت کرنا کیا معنی ان کے اس دیوتا کو برج میں (دوبارہ) متسلط کر کے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ خود بھی کنھیا جی (کرشن جی) کے معتقد اور آدھے ہندو اور آدھے مسلمان ہیں۔ جے دیو کی نظمیں جن میں رادھا کشن کے حسن و عشق کی تصویریں کھینچی ہوئی ہیں اکبر کے بہت ہی پسند خاطر تھیں۔ ہندو اسے کرشن کا پریمی مانتے ہیں۔ جہانگیر میں بھی راجپوت خون کی آمیزش تھی۔ وہ بھی اکبر کی طرح کنھیا جی کا بہت معتقد تھا۔ شاہجہان جس کی ماں راجپوت راجکماری تھی شیو جی کا بڑا بھگت اور سدھ روپ سنیاسی کا مرید تھا"۔ (صفحہ: ۱۸۶)

۶۔ "بابر نے جو یک جہتی کا رشتہ قائم کیا تھا۔ اور اکبر، جہانگیر، شاہ جہان نے جس تعلق کو مضبوط کیا تھا اورنگ زیب نے اپنی حماقت سے توڑ دیا"۔ (صفحہ: ۶۶۹)

۷۔ "اورنگ زیب قوم راجپوت کا جانی دشمن تھا۔ مظلوم راجپوتوں نے اس کے ظلم کے انتقام میں اس کی نسل کو نیست و نابود کر دیا۔ صرف ایک صدی میں ملک نے اس کے کمبخت ہاتھوں سے خلاصی پائی لیکن ظالم اسرائیل کی آخری نسل کے ظالم (افغان) ہمیشہ کے واسطے

اورنگ زیب کی طرح گناہ کے شریک رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے ہر ایک بت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں ذرا بھی خیال رحم نہ کیا اگر یہ ظالم (افغان) ایک یادو نشانی باقی رہنے دیتے۔ تو ہمیں شاید ان کے احکام و رسوم، دستور و رواج، دلاوری، شجاعت عدل و انصاف کا فوٹو دنیا کے سامنے کھینچ سکتا لیکن ان کی نقصان رسانی و غارت گری کی عادت نے ایک بھی نقش باقی نہ رکھا، جو چیزیں قابل دید و پرستش تھیں ان کو تباہ کر ڈالا۔" (صفحہ ۱۴۷)

۸۔ "کھلجی نے سمت ۱۳۳۱ مطابق ۱۲۷۵ء میں تخت پر جلوہ فرمایا اس کے عہد حکومت کو تاریخی دنیا میں خاص شہرت حاصل ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب پٹھان بادشاہ علاؤ الدین خلجی نے وحشیانہ بے رحمی سے چتوڑ پر ۱۲۹۰ء میں دھاوا کیا، ہندوستان کے تمام شہروں سے بارونق اور مال و دولت سے مالا مال تخت گاہ تباہ و برباد کی گئی۔" (صفحہ ۴۹۸)

۹۔ ایک مندر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: "اندر کی طرف سیاہ سنگ مرمر کی دیوار ہے، جس پر دیوتاؤں کی تصویریں کھدی ہیں اور ان راجاؤں کے تذکرے کندہ ہیں جنہوں نے منقوش پتھر آویزاں کرائے تھے۔ افسوس کہ اب ان پتھروں سے قدیم حالات دریافت نہیں ہو سکتے وجہ یہ کہ تمام منقوش پتھر ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں، اور انہیں پتھروں سے اولاد اسماعیل یعنی روہیلے پٹھانوں نے چولہوں کا کام لیا ہے۔" (صفحہ ۵۰۱)

۱۰۔ "ہمایوں کے عزل سلطنت سے ان کی بھی مٹی خراب رہی، شیر شاہ نے چغتائی فرمانرواؤں سے حکومتیں چھین لیں اور پٹھانوں کی بادشاہت کے قدم جما دیئے۔" (صفحہ ۵۸۹)

قوم افغان

افغان قوم کے مشائخ علماء و امراء، عوام و خواص، مرد و زن، بادشاہ، بزرگان دین، فقیر،

تو اب سب اس پر متفق چلے آرہے ہیں کہ افغان نسل ابراہیمی سے اور بنی اسرائیل ہیں۔ لہٰذا اس فیصلے کے خلاف کسی غیر افغان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس میں تاویل کرے۔ اپنے آباؤ اجداد کے متعلق اُن کی اولاد کا کہنا زیادہ معتبر ہوتا ہے بہ نسبت غیروں کے اور ان لوگوں کو جو بزرگان دین کے مذکورہ عقیدے اور رائے کے خلاف سوچتے ہیں ان کو چاہیئے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے سبق حاصل کریں جو ذیل میں درج ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ جس زمانے میں عرب کے وفود اسلام لانے کے لئے نبی کریمؐ کے پاس آتے تھے تو عرب کے شاہی خاندان کا ایک وفد کندہ سے آیا۔ اس کے سردار اشعث نے اثنائے کلام میں آپ سے عرض کیا۔

"ہم لوگ آکل المرار کی اولاد ہیں، اور آپ بھی آکل المرار کے لڑکے ہیں۔ یعنی ہم اور آپ ایک خاندان کے ہیں۔ آنحضرتؐ نے یہ کلام سن کر ہنس کر فرمایا، نہیں! ہم نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں، نہ تو ہم اپنی ماں پر تہمت لگاتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کرتے ہیں۔"

الغرض کافی تحقیق کے بعد میری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان جو نسل افغان سے متعلق ہیں ان کو بھی اپنے اجداد کے اقوال و اعمال اور معلومات پر یقین کامل رکھنا چاہئے کیونکہ نسب کے بارے میں ان کی معلومات کی نسبت ان کے بزرگ زیادہ حقیقت، خلوص اور سمجھداری پہ تھے، وہ اپنی اصل نسل خوب جانتے تھے، اور جیسا کہ ہم اُن کے وارث ہیں تو ہمیں اپنے موروثوں اور بزرگوں کی اس وراثت پہ جو نسب کے بارے میں ہے بغیر شک و شبہ مضبوطی سے قائم رہنا چاہئے سیاست کے لئے دوسرے حربے بھی بہت ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ افغان، پٹھان اور پختون سب ایک ہی قوم اور سامی النسل ہیں، اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ اگر وہ اپنا شجرہ نسب ہمیں سے آگے نہیں لیجا سکتے تو اس میں عیب کی کوئی بات نہیں، دنیا کی کوئی قوم اپنا شجرہ پوری طرح نہیں بیان کر سکتی۔

افغان بنی اسرائیل ہیں،

ایک نامور عالم و فاضل اور مورخ مولوی نجم الغنی خان رامپوری اپنی تصنیف اخبار الصنادید جلد اول (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۸ء) میں لکھتے ہیں کہ:۔۔۔۔

افغانوں کے نسب پر جو اعتراضات تم نے سنے اُن کا مآل یہ ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل نہیں لیکن افغانوں میں یہ متفق علیہ تاریخی امر ہے کہ قیس مورث اعلیٰ اُن کا بنی اسرائیل میں سے تھا۔ یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں یعنی تینوں فرقوں نے بالاتفاق تسلیم کی ہے کہ حضرت عیسیٰ سے قریباً سات سو برس پہلے (اشوریوں) اور بخت نصر بابلی نے بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے (نینوا اور) بابل میں پہنچا دیا تھا۔ اور اس حادثے کے بعد بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے صرف دو قبیلے یعنی یہودا اور بنیامین اپنے ملک میں واپس آئے اور دس قبائل اُن کے (کلھم) مشرق میں رہے۔ اور چونکہ اب تک یہود پتا نہیں بتلا سکتے کہ وہ قبائل کہاں ہیں اور نہ انہوں نے اُن سے خط و کتابت اور رشتہ کا تعلق رکھا۔ اس لئے اس واقعہ سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ انجام کار وہ قومیں مسلمان ہو گئی ہوں گی پھر جب ہم اس قصے کو اس جگہ چھوڑ کر افغانوں کی سوانح پہ نظر کرتے ہیں کہ وہ اپنے باپ اور دادوں سے قدیم سے یہ سنتے آئے ہیں کہ دراصل وہ اسرائیلی ہیں تو اس امر میں کچھ بھی شک و شبہ نہیں رہتا کہ یہ لوگ انہیں جلاوطن دس قبائل میں سے ہیں جو مشرق میں ناپید نشانی بتلائے جاتے ہیں اور انہیں اسرائیلیوں میں سے کشمیری بھی ہیں جو اپنی شکل اور پیرایہ میں افغانوں سے بہت کچھ ملتے ہیں۔ ایسے امر

کی بحث کے وقت میں کہ ایک قوم پشت بہ پشت اپنے خاندان اور نسب کی نسبت تسلیم کرتی چلی آئی ہو یہ بالکل نامناسب ہے کہ ہم چند بیہودہ قیاس کو ہاتھ میں لے کر ان کے مسلمات کو رد کر دیں۔ اگر ایسا کیا جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم بھی اپنی صحت قومیت کو ثابت نہیں کر سکتی۔ پھر جبکہ افغانان اپنے تئیں اسرائیلی ظاہر کرتے ہیں تو سخت بیوقوفی ہو گی کہ خواہ مخواہ اُن کے مسلمات قدیمہ سے انکار کیا جائے۔ قوموں کی جانچ پڑتال میں بھی کافی ثبوت اور اطمینان کے لئے واضح استقامت ہے کہ جو کسی قوم میں ان کے خاندان اور قومیت کی نسبت مشہور واقعات چلے ان کو مان لیا جائے۔ اور ایسے امور میں اس سے زیادہ ثبوت ممکن ہی نہیں کہ ایک قوم باوجود اپنی کثرت برادری اور کثرت انتشار نطفہ کے ایک قول پہ متفق ہو۔ اور اگر یہ ثبوت قابل اعتبار نہ ہو تو پھر اس زمانے میں مسلمانوں کی جس قدر قومیں ہیں مثلاً سید اور قریش اور مغل وغیرہ یہ سب بے ثبوت اور صرف زبانی دعوے ٹھہریں گے۔ لیکن یہ ہماری سخت غلطی ہو گی کہ ہم ان اخبار مشہور و متواتر کو نظر انداز کریں جو ہر ایک قوم اپنی صحت قومیت کے بارے میں بطور تاریخی امر کے اپنے پاس رکھتی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنے خاندان کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغات کر دے۔ مگر ہمیں نہیں چاہئے کہ مبالغات کو دیکھ کر یا کچھ فضول اور بے ربط باتیں پا کر اصل امر کو بھی رد کر دیں۔ بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ وہ زوائد جو درحقیقت فضول معلوم ہوں چھوڑ دیئے جائیں اور نفس الامر کو جس پہ قوم کا اتفاق ہے لیا جائے۔ پس اس طریق سے ہر ایک محقق کو ماننا پڑے گا کہ قوم افغان ضرور بنی اسرائیل ہے ہر ایک کو خود اپنے نفس کو اور اپنی قوم کو زیر بحث رکھ کر سوچنا چاہئے

کہ اگر وہ قوم جس میں وہ اپنے تئیں داخل سمجھتا ہے کوئی دوسرا شخص محض
چند قیاسی باتیں مدِ نظر رکھ کر اُس قوم سے اس کو خارج کر دے اور تسلیم
نہ کرے کہ وہ اس قوم میں سے ہے۔ اور اس کے ان ثبوتوں کو جو پشت
در پشت کے بیانات سے معلوم ہوئے ہیں نظر انداز کرے اور مجمع
عظیم کے اتفاق کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھے تو ایسا آدمی کیسا فتنہ انگیز معلوم
ہوتا ہے۔ پس بقول شخصے "ہر چہ بر خود نہ پسندی۔ بر دیگراں مپسند"
یہ بھی نامناسب ہے کہ دوسروں کی قسم قومیت پر جو ایک بڑی قومی
اتفاق سے مانی گئی ہے ناحق کی جرح کی جائے۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے
اور ہمارے پاس کیا دلیل کہ ہم ایک قوم کے مسلمات اور متفق علیہ
امر کو یوں ہی زبان سے رد کر دیں۔ جب ایک امر معقول ازروئے قوم
کے اتفاق سے صحیح قرار دیا گیا ہے۔ تو اس کے بعد قیاس کی گنجائش نہیں۔
یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سی باتیں فضولی اور شیخی کے طور پر بعض
قوموں کے لوگ اپنی قومیت کی نسبت بیان کرتے ہیں۔ لیکن محقق لوگ
فضول باتوں کی وجہ سے اصل واقعات کو ہرگز نہیں چھوڑتے "خذ ما
صفا ودع ما کدر" پر عمل کر لیتے ہیں۔ مثلاً گوتم بدھ کے سوانح میں
یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ منہ کی راہ سے پیدا ہوا تھا لیکن جب ہم
گوتم کے سوانح لکھنا چاہیں تو ہمیں نہیں چاہیئے کہ منہ کی راہ کی
پیدائش پر نظر ڈال کر بدھ کے اصل وجود ہی سے انکار کر دیں۔ اسی
طرح جب کسی خاندان کا پتہ ایک معلوم حد تک پہنچ کر رہ جاتا ہے تو
پرانی باتوں پر فخر کرنے والے لوگ آسمانی پیدائش بننے کو چاند اور سورج
وغیرہ سے سلسلہ جا ملاتے ہیں۔ چنانچہ راجپوتوں کی شاخ میں چندر بنسی
اور سورج بنسی دو بڑے مشہور خاندان ہیں۔ پھر کوئی یہ کہہ سکتا ہے
کہ ان کا کوئی مورثِ اعلیٰ نہ ہوگا۔ اسی طرح راجپوتوں میں ایک شاخ

اگ بنسی ہے۔ جو خود کو آگ کی پیدائش بتلاتے ہیں تو اس قصے کی بات
سے ان کی قومیت اور وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ تاریخ نویسی
ایک بڑا نازک امر ہے۔ اس میں وہ شخص جادۂ استقامت پر رہتا ہے
جو افراط و تفریط دونوں سے پرہیز کرے۔ یہ اعتراض بھی ٹھیک نہیں
ہے کہ اگر افغان لوگ عبرانی الاصل تھے تو ان کے ناموں میں کیوں
عبرانی لفظ نہیں اور ان کا شجرہ پیش کردہ توریت کے بعض مقامات
سے کیوں اختلاف رکھتا ہے۔ یہ سب قیاسی باتیں ہیں جو قومی تاریخ
اور تواتر کو مٹا نہیں سکتیں۔ دیکھو نبی علیہ السلام نے قریش کے اس
شجرے کو صحیح نہیں قرار دیا جو وہ لوگ حضرت اسماعیل تک پہنچایا کرتے تھے
اور بجز چند پشت کے باقی سے سکوت فرمایا ہے۔ مگر اس سے یہ لازم
نہیں آتا کہ قریش بنی اسمٰعیل نہیں ہیں۔ پھر جبکہ قریش جو علم انساب میں
بڑے حریص تھے تفصیل وار سلسلہ یاد نہ رکھ سکے۔ تو یہ قوم افغان جن
میں اکثر غفلت میں زندگی بسر کرنے والے گذرے ہیں۔ اگر انہوں نے
اپنے سلسلے کی تفاصیل بیان کرنے میں غلطی کی یا کچھ جھوٹ ملا یا۔ تو اصل مقصد
میں کیا فرق آ سکتا ہے۔ اور اب توریت بھی کون سی ایسی محفوظ ہے
جو نصِ قطعی کا حکم رکھتی ہو۔ غرض یہ نکتہ چینی خوب نہیں اور یہ بات بھی
صحیح نہیں کہ افغانوں کے نام عبرانی طرز پر نہیں۔ بھلا بتاؤ کہ یوسف زئی
داؤد زئی، سلیمان زئی اور موسیٰ خیل یہ عبرانیوں کے نام ہیں یا کچھ
اور ہے۔ ہاں جب یہ لوگ دوسرے ملکوں میں آئے تو ان ملکوں کا
رنگ بھی ان کی بول چال میں آ گیا۔ دیکھو سادات کے نام بھی ہمارے
ملک میں چمن شاہ اور مگن شاہ اور متو شاہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔
تو کیا اب ان کو سید نہیں کہو گے؟ کیا یہ عربی نام ہیں۔ غرض یہ بیہودہ
نکتہ چینی اور نہایت قابل شرم خیالات ہیں۔ ہم قوم کے متواترات سے

کیوں انکار کریں۔ اس سے عمدہ تر اور صاف تر ذریعہ حقیقت شناسی کا ہمارے ہاتھ میں کون سا ہے کہ خود وہ قوم جس کی اصلیت ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں ایک امر پر اتفاق رکھتی ہے۔ ماسوا اس کے دوسرے قرائن صاف بتلا رہے ہیں کہ حقیقت میں یہ لوگ اسرائیلی ہیں۔ مثلاً ایک قرینہ افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے پر یہ ہے۔ کہ افغانوں کا یہ بیان کہ قیس ہمارا مورث اعلیٰ ہے ان کے بنی اسرائیل ہونے کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ یہودیوں کی کتاب مقدس میں جو کتاب پہلی تاریخ کے نام سے موسوم ہے اس میں باب ۹ آیت ۳۹ میں قیس کا ذکر ہے۔ اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے۔ کہ یا تو اسی قیس کی اولاد میں سے کوئی دوسرا قیس ہوگا۔ جو مسلمان ہوگیا ہوگا۔ اور یا یہ مسلمان ہونے والے کا کوئی نام ہوگا اور وہ اس قیس کی اولاد میں سے ہوگا۔ اور پھر باعث خطائے حافظہ اس کا نام بھی قیس سمجھا گیا۔ بہر حال ایک ایسی قوم کے منہ سے قیس کا لفظ نکلنا جس کو یہودیوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رہا ہو اور محض ناخواندہ تھی یقینی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قیس کا لفظ اپنے آباؤ اجداد سے سنا تھا کہ اُن کا مورث اعلیٰ ہے"۔

اس کے بعد مصنف مذکور کافی دلائل اور قرائن سے ثابت کرنے کے بعد آخر میں بحث کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"پھر جبکہ افغانوں کی قوم کے اسرائیلی ہونے میں اتنے قرائن موجود ہیں۔ اور خود وہ تعامل کے طور پر اپنے باپ دادوں سے سنتے آئے ہیں کہ وہ قوم اسرائیلی ہیں اور یہ باتیں اُن کی قوم میں واقعات شہرت یافتہ ہیں تو سخت ناانصافی ہوگی کہ ہم تحکم کے طور سے

اُن کے بیانات سے انکار کریں۔ ذرا یہ تو سوچنا چاہئے کہ اُن کے دلائل کے مقابلہ پر ہمارے ہاتھ میں انکار کی کیا دلیل ہے۔ یہ ایک قانونی مسئلہ ہے۔ کہ ہر ایک پُرانی دستاویز جو چالیس برس سے زیادہ کی ہو وہ اپنی صحت کا آپ ثبوت ہوتی ہے۔ پھر جبکہ صدہا سال سے دوسری قوموں کی طرح، جو اپنی اپنی اصلیت بیان کرتی ہیں افغان لوگ اپنی اصلیت قوم بنی اسرائیل قرار دیتے ہیں تو ہم کیوں جھگڑا کریں اور کیا وجہ ہے کہ ہم قبول نہ کریں۔ یاد رہے کہ یہ ایک دو کا بیان نہیں۔ یہ ایک قوم کا بیان ہے جو لاکھوں انسانوں کا مجموعہ ہے اور پشت بہ پشت گواہی دیتے چلے آئے ہیں"۔

روشن خان ساکن نواں کلی
تحصیل صوابی۔ ضلع مردان
بروز جمعہ بتاریخ ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۸۱ء

ایک ضروری وضاحت

گزشتہ صفحات میں آپ صاحبان نے جو مقالہ مطالعہ کیا وہ
۱۷ اپریل ۱۹۸۱ء بروز شنبہ کے اُس مذاکرہ میں پڑھا گیا تھا جو کمیونٹی سنٹر
ہال مردان (پشاور) میں ہوا تھا۔ اس مقالہ میں صرف بعض دلائل یا
حوالہ جات کا جزوی اضافہ کیا ہے لیکن اگلے صفحے سے آخر تک جو
مطالب آپ صاحبان ملاحظہ فرمائیں گے وہ تمام اس کتابچہ کی
ترتیب کے وقت اضافہ کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہی ہے
کہ مطالب میں تکرار نہ ہو اور قارئین کرام کے لئے بارِ خاطر نہ
ہو۔ مجھے امید ہے کہ میں اس مقصد میں کامیاب ہوا ہوں۔ قارئین
فوراً محسوس فرمائیں گے کہ اس حصے میں کئی نئی اور دلچسپ باتیں
ہیں اور وہ انھیں پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

روشن خان،
زان کلی ۔ ضلع مردان
پشاور، پاکستان

تحقیق مزید

ایک تاریخی حقیقت

موجودہ صدی کے اوائل سے قبل افغانوں کے متعلق آرین نظریہ کا کہیں
ذکر تک نہ تھا لیکن کچھ عرصہ سے بعض مورخین، افغان نسل کا تعلق آریہ سے ملاتے
ہیں اور بعض نے تو افترا اور غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ
"خانجہان لودی ابن دولت خان نے جو شہنشاہ جہانگیر کا ایک سپہ سالار
تھا ایک شخص نعمت اللہ ہروی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ افغانوں
کی تاریخ لکھے چنانچہ اس نے "مخزنِ افغانی" کے نام سے ایک کتاب لکھی
جس میں پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ افغان بنی اسرائیل ہیں اور اس کے
بعد یہی کتاب اس نظریہ کا ماخذ مانا جاتا ہے"۔

معترض کا مطلب یہ ہے کہ مخزنِ افغانی میں یہ نظریہ کہ افغان بنی اسرائیل
ہیں، غلط پیش کیا اور جو کچھ لکھا غلط لکھا، اور اس کا یہ قیاس ہے کہ پٹھان نسلاً
آرین ہیں جیسا کہ اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

"خلاصہ یہ ہے کہ پختون قوم آریہ قبائل کی ایک شاخ ہے"
لیکن نعمت اللہ ہروی کی تحریر کا یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ افغانوں کے بنی
اسرائیل ہونے کا نظریہ غلط ہے؟ اس خیال میں پیچیدگی ہے نہ تحریر میں الجھاؤ۔
سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ نعمت اللہ ہروی نے تاریخ کی ایک حقیقت
اور مصدقہ بات پہلی بار تحریر میں ضبط کر دی اور وہ بات جو سینکڑوں برس
سے ایک قومی روایت کی حیثیت سے مشہور چلی آ رہی تھی کتاب میں لکھ دی۔
اور یہ بھی درست نہیں کہ مخزنِ افغانی میں پہلی بار یہ بات لکھی گئی۔ جیسا کہ آگے چل

کہ اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مخزن افغانی ایک مستند کتاب ہے اور فاضل مصنف نے اسے پرانی کتابوں سے اخذ کیا ہے اور اس وقت کے افغان مشاہیر اور اکابرین سے استفسار و مشورہ اور مکمل تحقیق کے بعد مرتب کی ہے جو افغان قبائل کے منتشر گروہوں اور خاندانوں کے شجروں اور ان کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس زمانہ میں شیخ آدم بنوری اور ان کے والد اسماعیل خان جو خانجہان لودی کے مشیر خاص تھے اور افغان قوم کے ایک اور نامور بزرگ حاجی خضر افغان اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی الکابلی جیسے بزرگان دین موجود تھے ان میں سے کسی نے بھی اس کتاب پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کتاب کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی تھی کہ جہانگیر کے ہاتھوں افغانی نام و نسب اور شعار و روایات کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ افسوس کہ معترض کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جہانگیر سے صدیوں پہلے بھی ایسی کتابیں موجود تھیں جن سے یہ ثابت ہے کہ افغانوں کا نسلی تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ مثلاً خواجہ نذیر احمد اپنی تصنیف "جنت ارضی" میں لکھتے ہیں کہ

"قوم افغان کے بنی اسرائیل ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے ہمارے پاس کئی پرانی تواریخیں جو نسل در نسل چلی آرہی ہیں ان میں ایک کتاب "روضۃ الالباب فی التواریخ الاکابر و الانساب" ہے جسے ابو سلیمان داؤد بن ابوالفضل محمد البناکتی نے ۷۱۰ھ (سات سو سترہ) میں تحریر کیا ہے دیباچہ میں افغانوں کے آبا و اجداد پر ظلم و ستم، در بدر ہونے، حراست میں ہو کر جلاوطن ہونے اور یروشلم کے کئی بار تباہ و برباد ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب اول میں حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) اور باب دوم میں ان کی اولاد افغان قبائل (بنی اسرائیل) کا ذکر تفصیل سے درج ہے۔"

ابن بطوطہ غوری خاندان والوں کے پاس ہرات میں کئی مہینے گزارنے کے بعد ان

کے بادشاہ، قاضیوں اور مشائخ سے ان کے حالات اور اصل و نسل معلوم کرنے کے بعد اپنے سفر نامہ جلد اول مولفہ ۷۴۷ھ میں غوریوں کے متعلق لکھتا ہے :-

"یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ ہیں جنہیں الغوریہ کہتے ہیں اور یہ لوگ غورالشام کی طرف منسوب ہیں اور ان کی اصل بھی اسی سے ہے۔"

معلوم رہے کہ شام کے علاقہ شرق اردن میں غور ایک علاقہ تھا جو بنی اسرائیل کی ایک شاخ کا مسکن اور غوریا بنی کے نام موسوم تھا۔

اسی طرح ابراہیم بٹنی کی تصنیف جو قلمی اور دیرینہ کتاب ہے اس میں بھی یہی ذکر ہے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔

ان کے علاوہ شیخ متی، ملک احمد اور شیخ عبدالواحد بلگرامی تینوں بابر بادشاہ کے ہمعصر تھے اور ان کے علاوہ شہنشاہ اکبر کے ہمعصر دیگر حضرات بھی مثلاً سعداللہ سرہ بنی اخون سالاک وازین سیاک اور اخون درویزہ جیسے علمائے تاریخ بھی افغانوں کو نسلاً بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ شہنشاہ جہانگیر ولد اکبر ولد ہمایوں ولد بابر سے قبل کا یہ حال تھا لیکن بعد میں بھی افغان مشاہیر اپنے آپ کو نسلاً اسرائیلی اور جہت دین سے مسلمان کہتے چلے آئے ہیں جیسے کہ عبداللہ قصوری، میاں عمر چمکنی، عبدالرحمن بابا مہمند سربنی، خوشحال خان خٹک، شاہ افغانستان امیر عبدالرحمن خان، حافظ رحمت خان روہیلہ، عبدالسلام خان عمر خیل یوسفزئی روہیلہ وغیرہ۔ ان میں سے چند تاریخی حقائق و بیانات پر نظر ڈال لینا پیش نظر مقصد کے لئے نہایت مناسب ہوگا۔

۱۔ ایک یہودی سیاح

ساڑھے آٹھ سو برس قبل (تقریباً ۱۱۳۵ء میں) ایک سیاح جس کا نام بنیمین اور تطیلہ کا رہنے والا ہسپانوی یہودی تھا، تاریخ کا عالم اور تاریخی واقعات کی

کہ اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مخزنِ افغانی ایک مستند کتاب ہے اور فاضل مصنف نے اُسے پرانی کتابوں سے اخذ کیا ہے اور اس وقت کے افغان مشاہیر اور اکابرین سے استفسار و مشورہ اور مکمل تحقیق کے بعد مرتب کی ہے جو افغان قبائل کے منتشر گروہوں اور خاندانوں کے شجروں اور ان کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس زمانہ میں شیخ آدم بنوری اور ان کے والد اسماعیل خان جو خانجہان لودی کے مشیر خاص تھے اور افغان قوم کے ایک اور نامور بزرگ حاجی خضر افغان اور مجددِ الف ثانی شیخ احمد سرہندی الکابلی جیسے بزرگانِ دین موجود تھے اُن میں سے کسی نے بھی اس کتاب پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کتاب کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی تھی کہ جہانگیر کے ہاتھوں افغانی نام و نسب اور شعار و روایات کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ افسوس کہ معترض کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جہانگیر سے صدیوں پہلے بھی ایسی کتابیں موجود تھیں جن سے یہ ثابت ہے کہ افغانوں کا نسلی تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ مثلاً خواجہ نذیر احمد اپنی تصنیف "جنت ارضی" میں لکھتے ہیں کہ

"قوم افغان کے بنی اسرائیل ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے ہمارے پاس کئی پرانی تواریخیں جو نسل در نسل چلی آرہی ہیں ان میں ایک کتاب "روضۃ الالباب فی التواریخ الاکابر و الانساب" ہے جسے ابوسلیمان داؤد بن ابوالفضل محمد البناکتی نے ۷۱۷ھ (سات سو سترہ) میں تحریر کیا ہے دیباچہ میں افغانوں کے آباؤ اجداد پر ظلم و ستم، در بدر ہونے، حراست میں ہو کر جلاوطن ہونے اور یروشلم کے کئی بار تباہ و برباد ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب اول میں حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) اور باب دوم میں اُن کی اولاد افغان قبائل (بنی اسرائیل) کا ذکر تفصیل سے درج ہے۔"

ابن بطوطہ غوری خاندان والوں کے پاس ہرات میں کئی مہینے گزارنے کے بعد ان

کے بادشاہ، قاضیوں اور مشائخ سے ان کے حالات اور اصل و نسل معلوم کرنے کے بعد اپنے سفرنامہ جلد اول مولفہ ۷۴۶ھ میں غوریوں کے متعلق لکھتا ہے:-

"یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ ہیں جنہیں الغوریہ کہتے ہیں اور یہ لوگ غور الشام کی طرف منسوب ہیں اور ان کی اصل بھی اُسی سے ہے۔"

معلوم ہے کہ شام کے علاقہ شرق اردن میں غور ایک علاقہ تھا جو بنی اسرائیل کی ایک شاخ کا مسکن اور غوریانی کے نام موسوم تھا۔

اسی طرح ابراہیم بٹنی کی تصنیف جو قلمی اور دیرینہ کتاب ہے، میں بھی یہی ذکر ہے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔

ان کے علاوہ شیخ ملی، ملک احمد اور شیخ عبدالواحد بلگرامی تینوں بابر بادشاہ کے ہمعصر تھے اور ان کے علاوہ شہنشاہ اکبر کے ہمعصر دیگر حضرات بھی مثلاً سعد اللہ سرہ بنی، اخون سالاک و اخون سیاک اور اخون درویزہ جیسے علمائے تاریخ بھی افغانوں کو نسلاً بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ شہنشاہ جہانگیر ولد اکبر ولد ہمایوں ولد بابر سے قبل کا یہ حال تھا لیکن بعد میں بھی افغان مشاہیر اپنے آپ کو نسلاً اسرائیلی اور جہت دین سے مسلمان کہتے چلے آئے ہیں جیسے کہ عبداللہ قصوری، میاں عمر چمکنی، عبدالرحمٰن بابا، حمید سرہ بنی، خوشحال خان خٹک، شاہ افغانستان امیر عبدالرحمٰن خان، حافظ رحمت خان روہیلہ، عبدالسلام خان عمر خیل یوسفزئی روہیلہ وغیرہ۔ ان میں سے چند تاریخی حقائق و بیانات پر نظر ڈال لینا پیشِ نظر مقصد کے لئے نہایت مناسب ہوگا۔

۱۔ ایک یہودی سیاح

ساڑھے آٹھ سو برس قبل (غالباً ۱۱۳۵ء میں) ایک سیاح جس کا نام بنیمین اور تطیلہ کا رہنے والا ہسپانوی یہودی تھا، تاریخ کا عالم اور تاریخی واقعات کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تحقیق کا بہت شائق تھا۔ وہ علاقہ جات جوزان یا جوزجان، پشت اور کوہستان غور و ہرات وغیرہ کے مغربی یا بادیۂ ایران یا دشت لوط کے مشرقی پہاڑوں تک یعنی نیشاپور سے لے کر کوہ قفص مکران تک کا علاقہ جہاں افغان لوگ رہتے تھے، آیا تھا[1] اور ان کے ساتھ کافی وقت گزارنے اور مکمل تحقیق کے بعد اس نے لکھا کہ :-

"نیشاپور یعنی مشرقی ایران کے پہاڑوں میں جو یہودی رہتے ہیں وہ ابتدائی (بنی اسرائیل) جلاوطنوں کی اولاد ہیں۔" (فلپ کے حتی۔ تاریخ شام)

بنیین کی مراد یہودیوں سے جو یہاں رہتے تھے، یہود کی نسل اور عبرانی قوم ہے نہ کہ یہودی مذہب کے ماننے والے، کیونکہ اس وقت یہ لوگ مسلمان ہو کر شریعت محمدی کو قبول کر چکے تھے اور اپنے آپ کو نسلاً بنی اسرائیل اور جہت دین سے مسلمان کہتے تھے، جیسا کہ افغان کے آباؤ اجداد سے یہ بیان متواتر چلا آ رہا ہے۔

تشریح مزید :- لفظ جوز مفرد ہے اور اس کی جمع جوزان یا جوزجان یا جوزگان ہے، اس نام سے ایک نہایت زرخیز علاقہ موسوم تھا جو نیشاپور کے متصل مشرق میں اور بلخ کے مغرب میں واقع تھا اور وہاں کے پہاڑوں میں جوزوان نام کا ایک شہر تھا جہاں علاقہ جوزان کا حاکم گرمی کے موسم میں رہا کرتا تھا۔ نیز شہر میمنہ جو طالقان سے دو منزل آگے بلخ جانے والی سڑک پر تھا، اب بھی بارونق شہر ہے۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی زمانہ میں شہر الیہودان یا الیہودیہ کہلاتا تھا اور جوزجان کا صدر مقام سمجھا جاتا تھا۔ یاقوت مورخ نے اس کو جہود الکبریٰ کے نام سے یاد کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ اس میں پہلے یہود آباد کیے گئے تھے جنہیں بخت نصر نے بیت المقدس

ص ۴۲۳

[1] ملاحظہ ہو نقشہ نمبرا تذکرہ (پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ) مصنف روشن خان (ملنے کا پتہ روشن خان اینڈ کمپنی۔ پھول چوک جونا مارکیٹ، کراچی نمبر ۲)

[2] ملاحظہ ہو نقشہ نمبرا تذکرہ محولہ سابق صفحہ ۴۲۳

سے منتقل کیا تھا۔ بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے میمنہ (مبارک شہر) کر دیا گیا۔"
(رجی لی اسٹرینج جغرافیہ خلافت مشرق)

۱۳۔ قدیم ترین تاریخ

سید عبدالجبار شاہ ستھانوی لکھتے ہیں کہ :-

الف : جوزی فس جس نے ۹۳ء میں "یہودیوں کی قدیم تاریخ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ اپنی تصنیف کی گیارہویں کتاب میں نحمیاہ نبی کے ساتھی قیدا یعنی مشرق سے یروشلم واپس جانے والے یہودیوں کے ضمن میں لکھتا ہے کہ "دس قبیلے دریائے فرات سے اُس پار اب تک آباد ہیں اور ان کی تعداد شمار سے باہر ہے" دریائے فرات سے اُس پار مشرق میں ملک فارس اور اس کے مشرقی علاقے یعنی خراسان (افغانستان) کشمیر، تبت، ہندوستان اور چین مراد ہیں۔"

ب :- تاریخ قدیم بخت نصر نامی کتاب کے حوالہ سے عبدالجبار شاہ یہ بھی لکھتے ہیں :-
"بنی اسرائیل، بخارا، مرو اور خیوا کے متعلقہ علاقوں میں بڑی تعداد میں موجود تھے۔"
(بنی اسرائیل یا ملت افاغنہ مؤلفہ عبدالجبار شاہ)

الغرض یہ اس حقیقت کی واضح نشانیاں ہیں جو بتلاتی ہیں کہ علاقہ جات مذکورہ میں ابتدائی جلاوطن یہودیوں کی اولاد یعنی بنی اسرائیل آباد تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور شریعت محمدی کو اختیار کر لیا اور سلیمانی، پختون، افغان، پٹھان وغیرہ مختلف ناموں سے انہوں نے دنیا میں بڑا نام پیدا کیا اور شہرت کے آسمان پر چاند ستاروں کی طرح خوب چمکے۔

(۱۴) ۱۸۹۸ء کا بندوبست اور تاریخ پشاور

کاغذات محکمۂ مال سرکار اور اس سے منسلک تاریخ پشاور میں افغان قائدین کے بیانات اور ان کے بیان کردہ شجرہ ہائے نسب درج ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افغان نسلاً بنی اسرائیل ہیں۔ گوپال داس نائب افسر بندوبست ۱۸۹۸ء نے

اپنی تاریخ پشاور کی فصل سوم (از صفحہ ۲۱۰ تا ۲۳۴) میں شیخ ملی اور ان کے بندوبست تقسیم اراضی کے بارے میں نہایت مفید معلومات درج کی ہیں۔ اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:-

"آخر کار خرشبون ابن سڑہ بن کی گیارھویں پشت میں قبیلہ اکازئی سے ایک شخص شیخ ملی نام پیدا ہوا۔ یہ شخص اپنے وقت میں سرگروہ قوم اور معاملہ فہم تھا، مردمانِ قوم افغان کو اس کے اقوال و افعال پسندیدہ معلوم ہوتے تھے، اکثر لوگ اس کی اطاعت سے روگرداں نہ تھے، قوم افغان کے خواص و عوام ہمیشہ اپنے گھریلو تنازعات میں اس کی طرف رجوع کرتے اور فیصلہ جات میں اس کے حکم کو حکم حاکم عادل جانتے تھے، اس نے املاک اراضی تقسیم کیا، اراضی چھ قطعات پر بانٹا، تعین حدود کے بعد ہر ایک قطعہ کو ہر ایک قبیلہ کے قبضے میں چھوڑ دیا۔ ہر شش قطعات چھ نام سے موسوم و مشہور ہوئے، یعنی ملکِ یوسف زئی، ملکِ محمد زئی، ملکو گگیانی، ملکِ داؤد زئی، ملکِ خلیل، ملکِ مہمند، اور اسی طرح سے قبائل مذکور قابض قطعات مسطور ہیں، البتہ چچھ خالصہ اس وقت شامل ملکِ مہمند تھی اور اب بقبضۂ اقوام مختلف ہے، عرصہ دراز سے قبیلہ مہمند یعنی اصلی مالکان تپہ ہذا، اس زمین کو چھوڑ کر کوہستان میں خارج از ضلع ہذا ہو کر مقیم ہوئے، چونکہ وہ زمین مقبوضہ سرکار (مغل) تھی اس لئے خالصہ نام رکھا گیا۔ تقسیم شیخ مذکور اس قدر معتبر اور مشہور رہی ہے کہ اب تک ہر شش پرگنہ مذکور میں ہر ایک مالک زمین مملوکہ جدی کو بنام دفتر شیخ ملی یاد میں لاتا ہے اور افغانان بپاس سنت شیخ ملی عامل ہیں۔"

پھر آگے لکھتا ہے کہ:-

"جب قوم افغان یعنی یوسف زئی، گگیانی، محمد زئی، داؤد زئی، خلیل، مہمند، علاقہ پشاور میں آکر آباد ہوئے تو اُن کے درمیان میں اراضی منقسم نہیں تھی اور نہ حصص معیّن تھے، لہٰذا آپس میں فتنہ و فساد برپا ہونے کا خطرہ ہمیشہ رہتا تھا تو شیخ ملی نے قوم مذکورہ کے مختلف فرقوں، خیلوں کے درمیان ویش یعنی تقسیم اراضی کا مشکل مسئلہ ایسے اصول پر حل کیا کہ آج تک اسی اصول پر فیصلہ جات اراضی ہوتے رہتے ہیں، اس موجد نے حیثیت اراضی کو نہیں دیکھا بلکہ ہر ایک خاندان اور قبیلہ کی تعداد کا لحاظ رکھ کر ایسے حصے مقرر کئے کہ قبائل کی نقل مکانی کے باوجود بھی ان حصص میں فرق نہیں آتا، ایسی طریقہ پر دوامی بندوبست کر دیا ہے کہ جس میں کسی طرح جھگڑا نہیں اٹھتا، اس وجہ سے شیخ ملی کا نام افغان قبائل میں ہمیشہ کے لئے نمایاں رہے گا اور بوقت تقسیم اراضی ہر پختون کے لب پر مرحوم موصوف کا نام ہوگا۔"

شیخ ملی موجد تقسیم اراضی نسلاً قبیلہ یوسف زئی کی ذیلی شاخ اکازئی اتمان منڈر سے متعلق ہے، ان کی اولاد اور خاندان والے اس وقت مواضعات کوٹھہ، ٹوپی، مینی، ضلع مردان میں اور نیز جگہ بہ جگہ ضلع ہزارہ میں آباد ہیں۔ اس وقت کا ایک مقولہ سا ہے۔ کوٹھہ تخت ٹوپی بازار سے مینئی ڈیلے د اکازئی اور سید شہید ابتدائی تقسیم میں یہ لوگ سوات میں آباد تھے، خصوصاً شیخ ملی اور آن کا قبیلہ اکازئی موضع تھانہ ایگی میں رہائش پذیر تھا۔ شیخ ملی نے تھانہ ایگی میں وفات پائی اور ان کی جگہ کے سیاسی مصالح کے پیش نظر سوات کے عین درمیانی حصہ میں دفن کیا گیا۔ (از تاریخ حافظ رحمت خانی)۔

شجرہ نسب یہ ہے:- شیخ ملی بن پیرک بن چارسدہ بن اکا بن اتمان بن منو بن منڈر بن شمر بن منڈے بن خشی بن قند بن خرشبون سڑہ بنی افغان اسرائیلی۔

خرشبون وہی نام ہے جسے فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں "کرسبون" کے نام سے یاد کیا ہے اور اُسے ماہویہ سوری کے دورِ حکومت کا جو اوائل اسلام میں تھا، ایک نامور شخص ظاہر کیا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

یکے نامور پیش او اندرون جہاں دیدہ بے نام او کرسبون

یہی کرسبون شیخ ملی کا جدِ امجد تھا۔ (حواشی تواریخ حافظ رحمت خانی صفحہ ۵۵۹)

شیخ ملی تقسیم اراضی میں کامل مہارت رکھنے کے علاوہ ایک سیاسی مدبر و منتظم اور قابل جرنیل بھی تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اچھے شاعر، بلند پایہ ادیب اور مصنف بھی تھے۔ اُن کی تصانیف میں تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں دو کتابیں پشتو یا پختو زبان میں لکھی گئی تھیں جن میں سے ایک کتاب نثر میں اور دوسری نظم کی صورت میں بیان کی جاتی ہے۔ دونوں کتابوں کا ایک ہی نام "فتح سوات" ہے۔ یہ تاریخ کی کتابیں ہیں چنانچہ اس بارے میں رحمن اللہ خان زمرلائی سالنامہ کابل ۱۹۳۳ء صفحہ ۳۹۹ میں لکھتا ہے کہ:

"شیخ ملی یوسف زئی جس نے "فتح سوات" نامی ایک تاریخی کتاب نظم کی شکل میں لکھی ہے، چونکہ شیخ ملی اپنی قوم کا رئیس تھا اور سوات کا علاقہ انہوں نے خود فتح کیا تھا، پشتو (پختو) زبان کی یہ اولین کتاب ہے اس کے سوا پشتو کی تحریر یا آثار اس سے قبل کا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ کتاب اس وقت برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔"

عبدالسلام خان عمر خیل روہیلہ یوسف زئی اپنی تصنیف "نسبِ افاغنہ" میں صفحہ ۹۰ پر لکھتا ہے کہ:

"پشتو زبان میں پہلی کتاب نثر کی صورت میں "فتح سوات" شیخ ملی نے تصنیف کی۔"

اسی صفحہ ۹۰ پر آگے لکھتا ہے کہ "تصنیف شیخ ملی میرے ذاتی انتخاب (یعنی میری لائبریری) میں درج (یعنی موجود) ہے۔"

تیسری کتاب "دفترِ شیخ ملی" کے نام سے مشہور تھی جسے ایک انگریز نے

۵۵-۱۱۷۶ء میں بمقام چکدرہ سوات کسی کے پاس دیکھ کر ذکر کیا ہے (رجوانہ یوسفی) شیخ ملی نے افغان قوم کا شجرۂ نسب ان کے صلاح و مشورہ سے مرتب کر کے اس کے مطابق اراضی کو تقسیم کیا۔ غالباً اس تقسیم کا کام ۹۱۸ھ سے شروع ہو کر چند برسوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ جب انگریزوں نے یہاں افغانوں کے ہر خاندان کے معمر اور باا ثر لوگوں کے بیانات لیے اور انہوں نے بندوبست کا کام انہی شجروں کے مطابق کروانا چاہا حالانکہ اس وقت تک شجروں کو بنائے ہوئے اور تقسیم اراضی پر صدیاں گزر چکی تھیں لیکن نہ انگریز نے اور نہ قوم میں سے کسی ایک شخص نے اس پر اعتراض کیا، بلکہ ہر قبیلہ اور اس کی شاخ نے اس شجرۂ نسب کی تصدیق کر دی۔ "تاریخ پشاور" میں لکھا ہے کہ علاقہ پشاور کے اراکین جرگوں کے سامنے دیگر مرتب کردہ شجرہ ہائے نسب بھی پیش کیے گئے مگر انہوں نے ان کے ماننے سے قطعاً انکار کیا اور انہیں مسترد کر دیا اور کہا کہ ہمارے پاس اپنے دیرینہ شجرہ ہائے نسب موجود ہیں جنھیں شیخ ملی نے مرتب کیا ہے۔ ہم صرف انہی شجروں پر عمل کریں گے چنانچہ حکومت نے ان کے پیش کردہ شجرہ ہائے نسب ہی کو صحیح تسلیم کر لیا اور بندوبست ۱۸۶۸ء کا کام اسی بنیاد پر مکمل ہوا۔

اس بارے میں خشی (یا خشے) قبائل اور غوریا خیل کے بیانات اور شجرہ ہائے نسب اور اس کے مطابق تقسیم اراضی کا ریکارڈ اس وقت تک محکمہ مال کے پاس پشاور میں اور اس کے علاوہ ہر تحصیل اور ہر ضلع میں محفوظ چلا آ رہا ہے۔ خشی قبائل اور غوریا خیل کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ وہ سڑابنی افغان اور اسرائیلی ہیں۔

شیخ ملی نے قوم کے مشورہ سے اس شجرہ کو جو سڑابنی افغانوں کا ہے حضرت یعقوب پیغمبر سے جا ملایا اور تقسیم کا کام بھی انہوں نے اس وصیت کے مطابق کیا جو حضرت موسیٰؑ نے میدان مواٰب میں اپنی قوم بنی اسرائیل کو کی تھی اور یوشع بن نون نے اُسے عملی جامہ پہنایا تھا۔ چنانچہ شیخ ملی اور اس کی قوم افغان نسلاً بنی اسرائیل سے تھے اور انہوں نے بھی حضرت موسیٰؑ کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے مفتوحہ ملک کو تقسیم کیا تھا۔

واضح رہے کہ پختون کے پہلے وقتوں میں بنی بخت کے نام سے مواٰب کے میدان یا

"ملک موآب جو شام کے علاقہ شرق اردن میں واقع تھا، میں آباد تھے، لہٰذا وہ باشندگان موآب کے نام سے بھی یاد کیے جاتے ہیں (ملاحظہ ہو کتاب مقدس میں گنتی، عزرا، نحمیاہ، اور یرمیاہ باب ۴۸)

کتاب مقدس کی ایک عبارت سے موآب کے محل وقوع کا تعین بھی ہو جاتا ہے:۔

"پھر خدا نے موآب کے میدانوں میں جو یریحو کے مقابل دریائے اردن کے کنارے واقع ہیں، موسیٰ سے کہا..."

(کتاب مقدس، گنتی، صفحات: ۱۵۴، ۱۵۸، ۱۶۲، ۱۶۳)

لہٰذا بنی بخت موآب سے مراد وہ اولاد بخت یعنی پختون ہیں جو علاقہ موآب کے باشندے رہے ہیں۔

۴۔ شیخ سعد اللہ سرہ بنی اسرائیلی

ایک اور تاریخی روایت ایک افغان بزرگ شیخ سعد اللہ اسرائیلی کی پیش کی جاتی ہے وہ اپنے نام کے ساتھ بنی اسرائیلی لکھا کرتے تھے۔ منتخب التواریخ میں ان کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:۔

"شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی کاکو کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی زندگی مختلف کیفیتوں سے گزری۔ انھوں نے نہایت مفید اور بلند مرتبہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں امام غزالی کی تصنیف "جواہر القرآن" پر ایک شرح بھی لکھی ہے۔ اکبر اعظم نے ان کو بلا کر گفتگو کی اور ان سے پوچھا، تم کس قوم کے ہو، انھوں نے برجستہ کہا، لکھنے والوں کی قوم سے۔ ان کی یہ بے تکلفی بادشاہ کو بڑی پسند آئی اور رخصت کیا۔"

۵۔ اخون سالاک و اخون سباک

اخون سالاک (رہ) اور اخون سباک کا شجرۂ نسب جو انھوں نے خود مرتب کیا تھا

اور جو کتابچہ کی شکل میں اپنی اصلی حالت میں اس خاندان کی ایک خاتون مسمات بی بی حمزہ بنت نور احمد شاہ موضع کھکھو (ضلع ہزارہ) سے ان کے داماد ڈاکٹر غلام سرور غیاث کی وساطت سے ملا ہے۔ کتابچہ کا نام "شجرہ نسب قوم اخون خیل پٹھان درانی" ہے اس میں ان کا شجرہ ایک سو پندرہ پشتوں میں یہودا بن حضرت یعقوب (اسرائیل) تک پہنچتا ہے جو بالتفصیل اس کتابچہ میں درج ہے۔ اخون سالاک تک کا شجرہ ان کے پوتے قیصر شاہ نے یوں درج کیا ہے۔

"قیصر شاہ بن عبدالرحمٰن بن ملک امان شاہ بن شاہ حسین بن میاں اعظم شاہ بن محمد صفا بن محمد اولیا بن اخون اشرف بن اکبر شاہ معروف بہ اخون سالاک"

اخون سالاک اور ان کے بھائی پیر عمر جو اخون سباک سے بھی یاد کئے جاتے ہیں اخون درویزہ اور اس کے ساتھیوں کے سخت مخالف تھے۔ اخون سالاک اور ان کے بھائی اخون سباک کے متعلق اخون درویزہ اپنی تصنیف تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"اس وقت افغانوں میں ایک قاعدہ بن گیا تھا۔ کہ جب ان میں ایک عالم فاضل ظہور میں آتا تو اس کو وہ میرے اور میرے پیر کے مقابلے میں مباحثہ کے لیے لاتے چنانچہ ایک روز پیر عمر (اخون سباک) و پیر چالاک (سالاک) ہر دو برادران پیران افغانان خٹک سے جو اس علاقہ میں آئے تھے ان لوگوں نے چاہا کہ ان کو اور میرے پیر کو مباحثہ کے لیے ملا دیں۔"

اخون درویزہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"تا روزے پیر عمر و پیر چالاک ہر دو برادر، را از پیران افغانان خٹک دریں حدود رسیدہ بودند و مردم ایں دیار خواستند کہ ایشان را و شیخنا را یکجا سازند... حضرت شیخنا سکوت ورزیدہ بقصد آنکہ از جاہل بے علم چہ پرسم... حضرت شیخنا بر محض سفاہت و ضلالت او تبسم نمودہ"

(تواریخ حافظ رحمت خانی اشاعت سوم ۱۹۸۲ء صفحہ ۲۹۹، ۲۲۸)

الغرض مخالفت کے باوجود دونوں فریق اس خاص مسئلہ پر متفق تھے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں اور اخون سالاک کے تو شجرے سے بھی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ خود بنی اسرائیل ہیں۔ سالاک اُچالاک دونوں ایک ہی شخص کے مختلف لقبی نام ہیں۔ جیسا کہ رضانی صاحب لکھتے ہیں:

سالاک مشہور السنہ در کتابہا چالاک است' اخون سالاک برادر ایشاں نیز مرید اخون پنجو صاحب بودہ کہ مزارش در ملک یوسف زئی تپہ سدوم در قریہ جبڑ دوچ بفاصلہ ۳ میل' از رستم بطرف شمال است۔

(تحفۃ الاولیاء صفحہ ۳۰)

۶۔ اخون پنجو اور اخون درویزہ

اخون پنجو اور اخون درویزہ کے آپس میں بھی تعلقات اچھے نہ تھے جیسا کہ ان دونوں صاحبان کے ایک خاص معتقد میر احمد شاہ رضانی اپنی تصنیف تحفۃ الاولیاء میں آگے دبے الفاظ میں لاشعوری طور پہ بیان کرتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے:۔

۹۹۱ھ میں سید علی ترمذی کی وفات کے بعد اخون درویزہ بونیر علاقہ یوسف زئی سے پشاور جاتے ہوئے موضع اکبر پورہ میں اخون پنجو کے پاس ملاقات کی غرض سے آئے تو نہ اخون پنجو اور نہ ان کے معتقدین سے کچھ التفات ہو سکی' بلکہ مکمل شناخت کے باوجود کسی فرد نے اس سے بات کرنا تک گوارا نہیں کیا۔ غالباً اخون درویزہ یہ ناپسندیدہ سلوک دیکھ کر مزید انتظار کئے بغیر خاموشی اور جلدی میں وہاں سے نکل کر پشاور روانہ ہو گئے' یہاں کے بعض اشخاص باہر نکل کر اُسے جاتے ہوئے دور تک پیچھے سے دیکھتے رہے۔

یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ اخون درویزہ نے اپنی تصنیف "تذکرۃ الابرار و الاشرار" میں جو ۱۰۰۱ھ میں اختتام پذیر ہوئی تھی' اخون پنجو کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

اخون پنجو کے انتقال پہ جو ماہ رمضان بروز دوشنبہ ۱۰۳۰ھ کو ہوا جس میں اُن کے مریدان کبار مثلاً اخون سالاک' الشیخ میاں علی الشیخ رحکار

معروف کاکا صاحب' الشیخ عبدالغفور عباسی چل گزی' وغیرہم سب جنازے پہ حاضر تھے اور پھر انہوں نے اخون پنجو کے بڑے بیٹے میاں عثمان کو سجادہ نشین بھی کرا دیا لیکن اس سلسلے میں اور اس اہم موقع پہ اخون درویزہ کا کہیں نام تک نہیں آیا۔ حالانکہ وہ ۱۰۴۸ھ تک صحت مند اور پشاور میں مقیم تھے اور اخون پنجو کے انتقال کے تقریباً آٹھ سال بعد ایک رات کو اچانک بیمار پڑے اور صبح کو انتقال کیا۔

(مفہوم۔ ماخوذ از تحفۃ الاولیاء صفحات ۳۸ - ۳۹)

ان باہمی اختلافات اور آپس کی رنجشوں کے باوجود تاریخ گواہ ہے کہ ان میں افغانوں کے نسب کے بارے میں کوئی اختلاف اور نزاع نہیں پایا جاتا' سب اس بات پہ متفق ہیں کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔

۷۔ بایزید انصاری اور اخون درویزہ

اخون درویزہ نے اپنی تصنیف تذکرۃ الابرار و الاشرار میں اس بارے میں ایک طویل بحث کی ہے اور بڑے دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔ آپ سید علی ترمذی المعروف پیر بابا متوفی ۹۹۱ھ کے مرید خاص تھے۔ یہ مذکورہ کتاب ان کے ایماء سے مغل شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں لکھی گئی تھی انہوں نے بھی اس بات سے اتفاق کیا ہے۔ مذکورہ دونوں صاحبان مدتوں بایزید انصاری کے ساتھ اختلاف سے رہے اور کئی مناظرے و مقابلے کئے حالانکہ بایزید خود اور ان کے رفقاء افغان قوم کے عالموں اور بزرگوں میں سے تھے مگر ان میں افغانوں کے شجرہ نسب کے بارے میں کبھی اختلاف نہیں ہوا' شجرہ نسب پہ انہوں نے نہ تبرا مانا اور نہ ہی انکار کیا۔ اس ضمن میں ان کی خاموشی عجب کہ دوسرے ہر پہلو پہ وہ مناظرے و مقابلے کرتے رہے تھے اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس بات سے پورا اتفاق تھا۔

۸۔ عبدالواحد افغان بلگرامی

شیخ عبدالواحد افغان مزار عالی بلگرامی کے نام سے ایک صوفی عالم گزرے ہیں جنھوں نے "سبع سنابل" کے نام سے ایک کتاب ۹۶۹ھ میں تالیف کی ہے جس میں انہوں نے اپنی طریقہ کا شجرہ یوں بیان کیا ہے :

"عبدالواحد بن ابراہیم افغان بلگرامی از مخدوم شیخ حسین افغان بنی اسرائیلی از شیخ عبدالصمد المعروف بہ شیخ صفی :

۹۔ عبداللہ قصوری خویشگی

عبداللہ قصوری خویشگی افغان جو ایک نامور بزرگ گزرے ہیں اپنی ایک کتاب "اخبار الاولیاء و شرح بستان الاصفیاء" ۱۰۱۱ھ میں افغانوں کو بنی اسرائیل کہتے ہیں اور کافی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ افغان وہی بنی اسرائیل ہیں جو شام و فلسطین سے اشوریوں اور بابلیوں کے ہاتھوں جلا وطن ہو کر یہاں مشرق میں آباد ہوئے تھے :

۱۰۔ میاں عمر چمکنی

میاں عمر چمکنی (پشاور) نے ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۶ء "دلیل المعانی شرح امالی" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے اور یہ اگرچہ علم عقائد سے تعلق رکھتی ہے۔ تاہم درمیان میں جگہ جگہ تاریخی مضامین بھی درج کیے ہیں۔ دیباچہ میں اپنے حالات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔

"پس یہ فقیر محمد عمر ابن محمد ابراہیم محمدی مشرب ہے اور جہت نسب سے مشہور افغان سے ہے اور واقعات اور حقیقت میں افغان ہونے کے علاوہ اپنی طرف کسی دوسرے قسم کی نسبت کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں کیونکہ اپنے نسب سے انکار کرنے پر وعید یعنی سزا کا حکم وارد ہے اس وجہ سے جو بات کہ نفس الامر

میں سچی ہے لکھی جاتی ہے۔ میرے والد ماجد جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ان کا نام ابراہیم اور نسب سے افغان ہے۔ افغان مذکور ملک طالوت کی اولاد ہیں اور ملک طالوت بنی اسرائیل سے تھے اور اسرائیل ایک نام ہے جو عبارت ہے مہتر یعقوب سے جو حضرت اسحاق کے فرزند اور حضرت اسحاق ابراہیم کے فرزند ہیں۔ علیہم السلام" (یوسف زئی افغان اشاعت چہارم ص۶۱)

۱۱۔ اخون محمد خان محمد زئی

اخون، حافظ، ملا محمد خان بن ملا دور خان افغان محمد زئی موضع عمر زئی اشنغر متوفی ۱۲۰۶ھ جو ایک جلیل القدر بزرگ ہونے کے علاوہ محقق، عالم، سربراہ قبیلہ اور مصنف بھی تھے انھوں نے اپنی تالیفات میں اپنا نام محمد بن اسرائیل ہشتنغری لکھا ہے۔

(مرآۃ الاولیاء)

۱۲، ۱۳۔ حافظ رحمت خان و عبدالسلام خان

حافظ رحمت خان روہیلہ نے اپنی تصنیف "خلاصۃ الانساب" میں اور عبدالسلام خان عمر خیل روہیلہ یوسفزئی نے اپنی تصنیف "نسب افاغنہ" میں قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ افغان بنی اسرائیلی ہیں"

یہی عقیدہ محمد اکبر خان نواب آف ہوتی اور سر صاحبزادہ عبدالقیوم آف ٹوپی کا تھا۔

۱۴۔ امیر عبدالرحمٰن خان

شاہ افغانستان امیر عبدالرحمٰن خان اپنی کتاب "دبدبۂ امیری" ۱۸۹۶ء میں لکھتے ہیں :-

"میں نے بچپن سے اب تک کوئی دن ایسا نہیں گزارا کہ جس روز کسی نہ کسی ملک و قوم کی تاریخ میں نے خود نہ پڑھی ہو یا مجھے پڑھ کر نہ سنائی گئی ہو"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"کل افغان سنی مسلمان ہیں اور افغان مورخین کے بیان کے موافق اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ ان کا نام افغان لفظ افغنہ سے مشتق ہے۔"

۱۵۔ مولانا غلام حیدر

مولانا غلام حیدر، موضع خلیل نزد شیوہ تحصیل صوابی اکتوبر ۱۹۳۸ء میں طالب علمی کے دوران موضع دہ بی بی میں جو بلخ سے ایک میل کے فاصلہ پر جانب مشرق واقع ہے مقیم تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ایک روز مجھے جمعہ کی نماز پڑھنے کے ارادہ سے بلخ شہر جانا پڑا۔ اتفاقاً یہاں کے چند آدمیوں سے سامنا ہوا۔ میں نے اُن پر اس خیال سے سلام کیا کہ وہ افغان ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہیں اور ان میں ایک شخص جس کا نام اسحاق تھا زیادہ سمجھدار تھا۔ پوچھ گچھ اور بحث شروع ہوئی۔ انھوں نے مجھے اس علاقہ کا افغان سمجھ کر فارسی میں گفتگو کی اور افغانوں کی تاریخ اور نسب کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہا کہ افغان لوگ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے بنیامین کی اولاد ہیں۔ میں نے ہاں کہہ کر مزید کہا کہ اسرائیلی بھی ہیں۔ اسحاق نے جواب میں کہا۔

"شما مردم از اولادِ بنیامین ہستی مگر اسرائیلی نیستی، چرا کہ شما مردم در زمانہ ماضی کہ از شریعت موسوی گریختی از سلسلہ اسرائیلی دور شدی و بسبب ترک شریعت موسوی ما مردم شمارا اسرائیلی نمی گوئیم۔"

۱۶۔ مولانا احسان الحق صاحب

جناب احسان الحق المعروف صاحب حق صاحب موضع یعقوبی تپہ رزڑ کا بیان ہے کہ وہ بغرض دینیات، دارالعلوم عثمانیہ اجمیر شریف میں ۱۹۳۹ء میں مقیم تھے کہ ایک روز تعطیل کے دوران چند ساتھیوں کے ہمراہ سیاحت کے لئے باہر گئے کچھ فاصلہ

پر ایک گاؤں تھا۔ کچھ لوگ بیٹھے نظر آئے۔ وہاں ہم بھی گئے۔ دیکھا کہ ایک معمر آدمی چارپائی پر بیٹھا ہے سر پہ عمامہ اور داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے۔ باقی آدمی پتھروں کی چوکیوں پہ بیٹھے ہیں۔ ہم سے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو۔ ہم نے کہا پٹھان ہیں اور صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس معمر شخص نے کہا۔ اَلشَّرِیہ بالسلطان۔ آؤ چارپائی پہ بیٹھو۔ پھر کہا۔

"پٹھان ایک عظیم قوم بنی اسرائیل ہے جس نے سینکڑوں سال تمام ہندوستان پر حکومت کی ہے۔"

ہمارے پوچھنے پہ انہوں نے بتایا کہ وہ راجپوت ہیں اور پتھروں پہ بیٹھے ہوئے لوگ ہندو، چند داس راجپوت کو ٹھاکر کہتے ہیں جیسے کہ ہمارے یہاں خانصاحب یا ملک صاحب بولتے ہیں۔

۱۷۔ چند دیگر اہم تواریخ

ان کے علاوہ اور بہت سے نامور مورخین ہیں جنھوں نے اپنی تواریخ میں افغانوں کے اس نسلی امتیاز اور تاریخی حقیقت پہ روشنی ڈالی ہے اور صاف صاف لکھا ہے کہ افغان نسل کے لحاظ سے اسرائیلی ہیں۔ یہاں صرف چند اہم تواریخ کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

"تاریخ مرصع" تصنیف افضل خان خٹک، "صولت افغانی" تصنیف زرداد خان ناغر، "تاریخ پختون" تصنیف قاضی عطاء اللہ خان مرحوم سرخپوش لیڈر اور وزیر تعلیم صوبہ سرحد، "تاریخ یوسف زئی افغان" تصنیف اللہ بخش یوسفی مرحوم، "تاریخ افاغنہ" تصنیف مولوی عبدالحمید خان "تاریخ خورشید جہان" تصنیف شیر محمد خان گنڈاپور، اور "تزک افغانی" و "شوکت افغانی" وغیرہ وغیرہ۔ اس نظریہ کے حامی یورپین مورخین میں سے سر ولیم جونز، الیگزینڈر برنس، مسٹر راورٹی وغیرہ خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اس بات پہ متفق ہیں کہ قوم پختون نسلاً بنی اسرائیل

ہے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "تذکرہ" پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ[1]

ایک اور اعتراف حق

اس باب میں افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے کے ثبوت میں لئے جو حوالے نقل کیے گئے ہیں وہ تاریخ کے تمام حوالے نہیں ہیں۔ ان کی تلاش میں بھی کوئی خاص کاوش نہیں کی گئی بلکہ یہ اس بحث میں بالکل سامنے کے حوالے ہیں جو قاری کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا کہ اس بحث کو زمانہ حال کے ایک مورخ اور محقق کی تازہ تحقیق پر ختم کیا جائے۔ میرا اشارہ پشتو زبان کے مشہور ادیب اور مصنف ڈاکٹر چراغ حسین شاہ مصنف "د دچراغ" میڈیکل آفیسر سول اسپتال لکی مروت ضلع بنوں (سرحد) کی طرف ہے۔ موصوف میرے نام ایک خط میں آداب وسلام مسنون کے بعد جو کچھ لکھتے ہیں، اس کا پشتو سے ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"آپ کا تحفہ "تذکرہ (پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ)" کافی دن پہلے مل گیا تھا لیکن عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے آپ کو شکریے کا خط نہ لکھا۔ اس کے لئے معذرت پیش کرتا ہوں۔

آپ نے پشتون (پختون) قوم کو سامی النسل ثابت کرنے کے لئے جو جدید انداز تحقیق اور طرز استدلال اختیار کیا ہے اس سے یہ اعتراض کافی حد تک دور اور شبہ رفع ہو گیا ہے کہ پشتون (پختون) مورخ روایات پر تکیہ کرتے ہیں اور ان کے پاس پختون قوم کو بنی اسرائیلی ثابت کرنے کے لئے تاریخی دلائل کی کمی ہے۔ آپ نے پشتو (پختو) زبان میں عبرانی زبان کے ذخیرہ الفاظ کا بھی پہلی بار مفصل جائزہ لیا ہے اور یہ امر کافی مضبوط دلائل سے ثابت کر دیا ہے

---

[1] تذکرہ کا تیسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ اور مزید اہتمام صحت کے ساتھ ۱۹۸۲ء میں شائع ہو گیا ہے۔ روشن خان اینڈ کمپنی، تمباکو ڈیلرز، پھول چوک جونا مارکیٹ۔ کراچی سے مل سکتا ہے۔

کہ پختون نسلاً بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زبان پشتو کا ماخذ بنی اسرائیل کے قومی زبان عبرانی ہے۔

(۲) بے نظیر کام کے لئے آپ پوری قوم کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

چند مزید حوالے

ہم اس بحث کو اختتام تک پہنچانے سے پہلے جنوب مشرقی ایشیا میں بنی اسرائیل کی موجودگی کے متعلق چند مزید محکم اور ناقابل تردید ثبوت پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ افغان (بنی اسرائیل) میدیوں یا آریوں کے پاس ملک شام سے جلاوطنی کی صورت میں ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے آباد تھے۔

۱۔ ابن بطوطہ نے ۷۳۴ھ میں ہرات سے ہندوستان جاتے ہوئے سندھ میں قیام کیا تھا اور وہاں کے حالات و واقعات دیکھ کر اس نے اور بعض دیگر مورخین نے بھی بلوچستان، سندھ اور ملابار، جنوبی ہند میں بنی اسرائیل یا افغان قبائل کی موجودگی بیان کی ہے اور انہیں یہودی النسل اور عراق کے شہر سامرہ سے نکلے ہوئے لوگ کہا ہے

۲۔ تاریخ سندھ میں مولانا اعجاز الحق قدوسی ابن بطوطہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"سندھ میں سومرہ کی سلطنت ۴۴۵ھ مطابق ۱۰۵۳ء میں قائم ہو کر ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء یعنی تین سو سات سال تک قائم رہی۔ ابن بطوطہ جو سندھ میں آیا تھا اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سومرہ قوم کے حکمران سلاطین دہلی کے ماتحت حکمرانی کرتے تھے۔"

اس کے بعد قدوسی صاحب نے ابن بطوطہ کا یہ بیان نقل کیا ہے :۔

"دو روز کی مسافت کے بعد ہم کشتی سے جنانی پہنچے جو دریائے سندھ کے کنارے ایک خوبصورت اور بڑا شہر ہے، جس میں خوشنما بازار ہے اور اس شہر میں اونار نامی سامری امیر رہتا ہے، یہاں کے رہنے والے وہ لوگ ہیں جن کو سامرہ کہتے ہیں۔ ان کے اسلاف یہاں اُس وقت آباد ہوئے جب حجاج کے زمانے میں سندھ فتح ہوا جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے۔ اور شیخ رکن الدین بن شیخ شمس الدین بن بہاؤالدین بن زکریا قریشی نے مجھے خبر دی کہ اُن کے جدِ اکبر، محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے موقع پر حاضر تھے اور یہ "سامرہ" اُس لشکر کے ساتھ آئے جس کو حجاج بن یوسف نے اپنی امارت کے زمانے میں عراق سے اس مقصد کے لئے بھیجا تھا۔"

۴۔ ابو ظفر ندوی صاحب نے اپنی کتاب "تاریخ گجرات" میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کا یہ بیان نقل کیا ہے :۔

"یہ لفظ جو عام طور پر سومرہ مشہور ہے۔ وہ دراصل سامرہ ہے، اور سامرہ عراق کا مشہور شہر ہے، یہ لوگ وہیں سے آکر آباد ہوئے اور قوت پاکر حاکم ہوئے۔" (تاریخ گجرات تصنیف ابو ظفر ندوی)

۴۔ مولانا عبدالحلیم شرر اپنی کتاب تاریخ سندھ کی پہلی جلد اس قبیلے کے متعلق لکھتے ہیں :۔ "یہ نومسلم یہودی تھے۔"

۵۔ مولانا کے اس بیان کی صحت میں کوئی شبہ نہیں۔ اس لیے کہ امام بلاذری نے اپنی کتاب "فتوح البلدان" (حصہ اول) میں شام و عراق کے واقعات میں السامرہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔ "السامرہ یہود ہیں اور اُن کی دو قسمیں ہیں، ایک کو الدستان اور دوسری کو الکوشان کہتے ہیں۔" (لفظ کش یا کوش واحد اور اس کا جمع کوشان یا کاسان ہے)

نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ دونوں افغان قبیلے ہیں جو اس وقت دوتانی اور کاسی یا کانسی، کوش کہلاتے ہیں (دراصل یہ ایک ہی قبیلہ کے مختلف نام ہیں) اور ان ناموں سے اب بھی علاقہ بلوچستان میں آباد ہیں جو الدستان اور الکوشان کے مترادف ہے نیز ان کے عزیز اور ہم نسل قبیلہ الشامرہ بلوچستان، کے متصل مشرق میں علاقہ سندھ میں بھی آباد ہیں اور سومرہ کے نام سے مشہور ہیں

۶۔ سندھ کے متصل بطرف مشرق جنوبی ہند بالخصوص ملابار میں بھی جلاوطن یہودی آباد ہو چکے تھے جیسا کہ تاریخ سندھ میں درج ہے کہ

"ملابار کا راجہ عہدِ رسالت ﷺ کے زمانے میں مسمی زمورن تھا جو یہودیوں کے قبیلہ سامری سے تھا، جب اس کو حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو اسلام قبول کر لیا اور سلطنت اپنے ولی عہد کو سپرد کر کے خود کشتی میں سوار ہو کر ملک عرب کی جانب روانہ ہوا لیکن راستے میں فوت ہو کر ساحل یمن میں مدفون ہوا۔"

واضح ہو کہ حضرت سلیمان کی وفات پر عراق میں سامرہ نامی شہر تعمیر ہو کر سلطنتِ اسرائیلیہ کا دارالحکومت بنایا گیا تھا جس کا پہلا بادشاہ یربعام تھا اور اُس کی وفات پر کاسی یا کوشی قبیلہ کے سردار مسمی زارح کو سامرہ نامی شہر میں سلطنت اسرائیلیہ کا بادشاہ بنایا گیا تھا۔ زارح ایک زبردست بادشاہ گزرا ہے (کتاب مقدس تواریخ ۱۵) وہ لاکھوں کی تعداد میں فوج رکھتا تھا۔ کاشی، کوشی کے متعلق کتاب مقدس (اردو) میں کئی مرتبہ ذکر ہوا ہے ملاحظہ ہو یرمیاہ باب ۲۶۔ باب ۳۶۔ باب ۳۹۔ باب ۴۴۔ اور ناحوم باب ۱۔ اور صفنیاہ باب ۱۔"

(طبع بائبل سوسائٹی انار کلی لاہور)

قبیلہ سومرہ کے علاوہ یہاں سمہ یا جام، لنگاہ اور لولا وغیرہ بھی انہی جلاوطن بنی اسرائیلی خاندانوں کے باقیات ہیں۔

۷۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ جلد دوم میں لکھتا ہے کہ :۔

"کنجی گری جو زمانہ حال میں ڈنگ نور کہلاتا ہے، اور کوچین (ہندوستان کے مشرقی حصے کی ریاست میں واقع ہے) یہودی اس شہر میں زمانہ قدیم سے رہتے۔ نصرانی بھی اُن کے بعد سے ۔ کہتے ہیں کہ توما حواری ۵۲ء میں یہاں یہودیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے"۔

۸۔ بائبل میں مرقوم ہے کہ

"توما رسول جو حضرت مسیح کا حواری تھا ایک مدت تک خراسان (افغانستان) میں تبلیغ کرتا رہا، بعد میں وہ ہندوستان چلا گیا اور مالابار کے یہودیوں میں تبلیغ کرتا رہا، اس کے بعد وہ مدراس چلا گیا اور وہاں شہید ہو کر میلاپور (علاقہ مدراس) میں دفن ہوا جس کی زیارت وہاں موجود ہے اور اس پر بڑا گرجا بنا ہے"۔

۹۔ عیسائی علماء اس پر متفق ہیں کہ جنوبی ہند میں جہاں مسیح کے حواری توما کی قبر موجود ہے، وہاں اسرائیلی قبائل موجود تھے جن کو مسیح کا پیغام پہنچانے کے لئے توما رسول ملابار اور مدراس تشریف لائے تھے"۔ (کنز الاعمال جلد ۲ صفحہ ۲۲)

۱۰۔ اسی طرح کشمیر کے متعلق بھی پادری برکت اللہ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ یہاں ابتداً عیسائی آباد تھے اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ افغانستان اور کشمیر میں اسرائیلی قبائل آباد ہیں۔ (تاریخ کلیسائے ہند صفحہ ۱۵)

۱۱۔ اس سلسلہ میں شام کے ایک مشہور مورخ کا بیان ذیل میں نقل کرتا ہوں تاکہ اہل علم حضرات اس پر تحقیقی نگاہ سے غور فرمائیں۔ اس میں ایک بڑا نقطہ "پشیتا" ہے جو ایسا لگتا ہے کہ یہ پشتو کا دوسرا نام ہے۔ دوم۔ پارتھیا یا خراسان میں جس کا نام اس وقت افغانستان اور اس کا ملحقہ علاقہ ہے، میں عیسائی عبادت خانوں کی موجودگی ہے، جس سے افغان مشاہیر کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ ابتداء ہی سے اکثر و بیشتر دعوت عیسوی قبول کر چکے تھے۔ ملپ کے حتی کا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"سُریانی کلیسا در شہر اڈیسا (الرّوحا شام) میں اس کلیسا کی بنیاد دوسری صدی

عیسوی کے آخر میں پڑی تھی۔ بعد کی صدیوں میں یہ کلیسا انطاکیہ اور مغرب کی یونانی روایات سے مطابقت قائم نہ رکھ سکا، چنانچہ انجیلوں کے متعلق اس نے اپنی تعبیرات اختیار کریں، پہلے وہ سلسلہ جاری رکھا جو اصطلاح میں اتفاق (اناجیل کہلاتا ہے) پھر "پشیتا" یعنی سادہ تعبیر اپنا لی گئی، پشیتا اُس وقت سے معیاری سریانی تعبیر مانی جاتی ہے۔ سریانی کلیسا کا پہلا ماہر دینیات افرائم سائرس (اسرائیل) تھا یہ شخص شامی کے لقب سے مشہور ہے، قریب ۳۰۶ء عیسوی میں پیدا ہوا اور ۳۷۳ء عیسوی میں وفات پائی، وہ دینی شاعر بھی تھا، اس نے سریانی زبان (جو آرامی ہی کی ایک شاخ تھی) میں مذہبی گیتوں کی ابتدا کی اور خانقاہی نظام جاری کرنے کا وہی ذمہ دار تھا۔ افرائم نصیبین (شام) میں پیدا ہوا پھر اڈیسا چلا آیا یہاں اس نے درسگاہ کو از سرِ نو زندہ کیا۔ یہ درسگاہ ایک عظیم الشان سُریانی یونیورسٹی بن گئی۔ سریانی کلیسا کی شاخیں مرو، ہرات، سمرقند، اور وسط ایشیا کے دوسرے مقامات پر چھٹی عیسوی کے وسط میں قائم تھیں"۔ (تاریخ شام)

۱۲۔ قاضی محمد یوسف صاحب فاروقی بحوالہ "تاریخ کلیسا" لکھتے ہیں :۔

"حضرت عیسیٰ کے حواری تھوما اور برتھولما اور حتی رسول مشرق کو ترکستان افغانستان اور ہندوستان کو آئے، افغان جو بنی اسرائیل ہیں، مذہب عیسوی میں داخل ہوئے۔ حضرت محمدؐ کے ظہور سے قبل مشرقی ممالک میں عیسائیت موجود تھی اور پھیلی ہوئی تھی (ظہور اسلام کے بعد قیس عبدالرشید وفد کے ساتھ دربارِ رسالت میں تشریف لے گیا اور مسلمان ہو گیا اور اُس وقت وہ نصرانی تھا"۔

پختون یا پشتون قوم کا نسلی اور آبائی تعلق اُن جلاوطن بنی اسرائیل سے ہے جنہیں اشوریوں اور بابل والوں نے یکے بعد دیگرے اُن کے وطن شام اور اس کے اطراف سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اور جن کی آبادیاں مشرق میں نواح بابل کے علاوہ ایران اور خراسان کے علاقوں سے لے کر دریائے سندھ کی وادی تک میدیوں یعنی آریاؤں کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ قوم پہلے شریعتِ موسوی اور پھر ہدایتِ عیسوی پہ قائم تھی اور جب اُن تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام پہنچی تو مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

الغرض عیسائیت اور یہودیت جس پہ یہ لوگ قائم تھے اُس تشنگی کو نہ بجھا سکتی تھی جس کو اسلام نے آکر بجھایا اور عیسوی اور موسوی تعلیمات کو صحیح جامہ پہنا کر ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اسلام کی بدولت ان میں نئی زندگی پیدا ہوئی اور ما بعد یہ سودی، شیخ حمید لودی، خصوصاً شہاب الدین محمد غوری کے دورِ اقتدار میں دشتِ لوط یا بادیہ ایران کے مشرقی پہاڑوں سے مشرق کی طرف دریائے سندھ کی وادی تک اُس سارے علاقے پہ جہاں جہاں ساسانیوں اور تاتاریوں کے غلبہ کی وجہ سے یہ لوگ ہجرت کر گئے تھے قبضہ کر کے دوبارہ آباد ہو گئے اور محمد غوری کے زیرِ قیادت وہ پنجاب اور سندھ پہ بھی قابض ہونے کے ساتھ ساتھ بنگال اور آسام تک بحیثیت حکمران جا پہنچے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا افغان قوم پہلے یہودیت اور بعد میں عیسائیت پر بھی قائم تھی دونوں مذاہب ایک ہی شریعت رکھتے تھے جو اللہ کی طرف سے انھیں پیغمبروں کے ذریعے سے پیش کی گئی تھی وہ خالص دینِ اسلام ہی تھا۔ آج ہم یہودیت اور عیسائیت کی قطعی تبدیل شدہ شکل سے موسوی اور عیسوی شریعتوں اور ان کی حقیقی صورت کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ یہ تو اسلام تھا جس نے آکر ہمیں بتایا کہ شریعت موسوی اور عیسوی کی حقیقی تعلیمات کیا تھیں۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کے مبعوث ہونے کی خوشخبری سنائی تھی اور ان کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی نوید جانفزا سنائی، اسی سبب سے افغان علماء بخوبی جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ اور اس کے بعد حضرت محمدؐ پیدا ہوں گے چنانچہ یہ لوگ ہمیشہ اِن انبیاء کی بعثت کی نوید مسرت سننے کے منتظر رہتے تھے اور جب انہوں نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کی بعثت کی خبریں اپنے اپنے وقت پہ سنیں تو ان کی تصدیق و توثیق کے لیے فوراً

اپنے وفود بھیجے تھے اور تصدیق ہوتے ہی ایمان لے آئے تھے۔ معلوم رہے کہ یہ عبارت جن حقائق پہ مشتمل ہے افغان علماء و محققین اس پہ متفق ہیں۔

۱۳۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواری:۔ حضرت عیسیٰ کے اصحاب یا حواری (جو افغانوں کے ہم نسل اور ہم زبان تھے) صدقِ دل سے دعوتِ حق تسلیم کر کے حضرت عیسیٰ پہ ایمان لا چکے تھے اور اُن کے علاوہ جس طائفہ نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت قبول کی تھی وہ طائفہ مشرق میں افغانوں ہی کا تھا جن کے متعلق حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا۔

"مجھے سوائے اسرائیل خاندان کی گمشدہ بھیڑوں کے اور کسی کے لئے نہیں بھیجا گیا"۔ (انجیل متی باب ۱۵)

اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی کہ:۔

"اسرائیل خاندان کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش میں جاؤ اور ان کو جاتے جاتے نصیحت کرو"۔ (باب ۱۰)

زمانہ قدیم سے افغان قوم میں مسلسل یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ان کو اپنے انبیاء کی طرف سے بشارت سنائی گئی تھی کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پر ایک ستارہ نمودار ہوگا جو اُن کی پیدائش کی نشانی ہوگی۔ اس کی تصدیق انجیل متی باب دوئم سے ہوتی ہے کہ انھوں نے مشرق میں وہ ستارہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پہ نمودار ہوتے دیکھ لیا۔ اُس وقت یہ لوگ شریعت موسوی پہ تھے اور گرجستان، آرمینیہ ایران اور خراسان، مجوسیوں کے زیرِ تسلط علاقوں میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ تورات کی زبان میں ان مذکورہ علاقوں کو مشرق کہا گیا ہے، مادی اور ہندو دال کے عہد میں خراسان کو میڈیا اور پارتھیا بھی کہتے تھے۔

اپنے انبیاء کی بشارت کے بموجب افغانوں نے اپنے علماء و اُمراء پہ مشتمل ایک وفد کو بیت المقدس بھیجا تاکہ وہ وہاں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی تصدیق کریں۔ کتاب ڈلوی عہد یونانی زبان سے پشتو ترجمہ ۱۹۳۵ء برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی

لاہور میں یوں درج ہے کہ:۔

"جس وقت حضرت عیسیٰ یہودیہ کے شہر بیت اللحم میں بادشاہ ہیرودیس کے عہد سلطنت کے دوران پیدا ہوئے تو جانب مشرق سے مجوسی لوگ بیت المقدس میں بدیں غرض آئے کہ وہ یہودیوں کے پیدا شدہ بادشاہ کی جائے پیدائش معلوم کریں کیونکہ اُن کے کہنے کے بموجب انہوں نے مشرق میں ان کا ستارہ دیکھا تھا۔ ہیرودیس بادشاہ نے جب یہ سنا تو بہت پریشان ہوا اور قوم کے تمام کاہنوں اور کاتبوں کو جمع کر کے اُن سے پوچھا کہ مسیح کہاں پیدا ہوں گے۔ انہوں نے کہا یہودیہ کے شہر بیت اللحم میں۔ اُس وقت ہیرودیس نے مجوسیوں کو خفیہ طور پر اپنے پاس بلایا اور اُن سے پوچھا کہ وہ ستارہ انہوں نے کس وقت اور کہاں دیکھا تھا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اُن کو بیت اللحم بھیج دیا اور تاکید کی چلے جاؤ اور نہایت احتیاط سے اُس لڑکے کے بارے میں دریافت کرو اور جب کبھی تم اُسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے بھی مطلع کرنا تاکہ میں بھی وہاں جا کر اُسے سجدہ کروں۔ انہوں نے جب بادشاہ سے یہ سنا تو روانہ ہوئے اور دیکھئے کہ وہی ستارہ جو انہوں نے مشرق میں دیکھا تھا اُن کے آگے آگے اوپر جاتا رہا اور وہاں تک گیا جہاں وہ لڑکا تھا اوپر کھڑا ہو گیا۔ یہ لوگ ستارہ دیکھنے پر بہت زیادہ خوش ہوئے اور جب اُس گھر میں داخل ہوئے تو اس لڑکے کو اپنی ماں مریم کے پاس دیکھا۔ اُس کے دیکھنے سے بہت خوش ہوئے اور اپنے اپنے صندوق کھول کر سونا، لوبان اور موتی اُسے پیش کئے۔ اُن کو خدا کی طرف سے خواب میں خبردار کیا گیا کہ ہیرودیس کے پاس نہ جائیں چنانچہ وہ دوسرے راستے سے واپس اپنے وطن چلے گئے۔"

اگرچہ انجیل متی باب دوم میں اُس افغان وفد کو مجوسی کے نام سے یاد کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد مجوسیوں کی مملکت اور علاقہ ہے نہ کہ ارکان وفد کا مذہب؛ مذہبی اعتبار سے تو یہ وفد اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو شریعت موسوی پہ تھے رہتا ہے

نے اُن کی رہنمائی کی تھی۔ کیونکہ وہی اہل اسلام تھے اور وہی جلا وطن اسرائیلی تھے۔ مگر فارسیوں کی مجوسی مملکت میں رہنے کی وجہ سے اُن کو مجوسی کہا گیا ورنہ کہاں مجوسی آتش پرست اور کہاں یہودی بادشاہ کی تلاش۔ جیسا کہ علامہ احمد حسین الہ آبادی اردو مترجم تاریخ ابن خلدون قبل از اسلام (حصہ دوم میں صفحہ ۲۵ حاشیہ پر) لکھتے ہیں:۔ کہ

"جس لفظ کا ترجمہ اس مقام پر مجوسی کیا ہے انگریزی ترجمہ میں وہاں ویزمن[1] کا لفظ ہے جس کے معنی دانا آدمی کے ہیں اور رومی لفظ مجی ہے جس سے مجوسیں نکلا ہے۔ مگر درحقیقت وہ لوگ جو آئے تھے مجوسی نہ تھے بلکہ قدیم حکماء کے فرقہ سے تھے جو حکمت و نجوم و ہیئت میں کامل اور اپنے مذہب میں مقتدا اور پیشوا گنے جاتے تھے۔"

الغرض حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کی تبلیغی مساعی تیزی سے شروع ہوئیں اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کی ہدایت کے مطابق جہاں بھی جلا وطن بنی اسرائیل آباد تھے اُن کے پاس پہنچے اور اُن کو حضرت عیسیٰؑ کا پیغام پہنچایا تھا۔ پختون خواہ میں حواریوں کا اس غرض سے آنا کافی دلائل سے ثابت ہے۔

۲۔ جب حضرت عیسیٰؑ کو تختہ دار پر چڑھائے جانے کی خبر پھیلی تو ہر ملک سے کافی لوگ بیت المقدس پہنچے جن میں افغان قوم کے نمائندے بھی تھے چنانچہ انجیل مذکور میں رسولوں کے اعمال باب دوم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"بیت المقدس میں مسافر یہودی مقیم ایماندار ہر قوم میں سے کہ آسمان کے نیچے آباد ہیں اور جب یہ آواز آئی تو سب جمع ہو گئے اور متفکر ہوئے اس لئے کہ ہر ایک نے یہ سنا کہ وہ میری زبان میں باتیں کر رہے ہیں۔ سب ہوش و حواس کھو بیٹھے اور حیرانگی کے عالم میں کہنے لگے کہ دیکھو وہ سب جو باتیں کر رہے ہیں گلیلی نہیں

---

[1] WISEMAN

ہیں کیا؟ پھر ہم کس طرح ہر ایک اپنے اپنے ملک کی زبان سن رہے ہیں جہاں ہم رہتے ہیں اور پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی ممالک پارتھیان، میدان، علامیان، عراق، یہودیہ، کپدکیا، پطنس، آسیہ، فروکیہ، پمفولیہ، مصر اور لیوا جو کرینی کی طرف ہے اور رومی مسافر اور نیز مرید کریتیان اور عرب ہم سب اپنی اپنی زبان میں اُن سے خدا کے بڑے کارنامے سُن رہے ہیں۔

پطرس اُن گیارہ حواریوں کے ساتھ اٹھا اور بلند آواز سے کہا: اے یہودیہ تم سب جو بیت المقدس میں جمع ہو اس پہ سمجھ جاؤ اور میری باتوں پہ دھیان رکھو (کچھ نصیحت کی اور پھر با آواز بلند کہا) اے اسرائیلیو! یہ باتیں اچھی طرح سن لو کہ عیسیٰؑ ناصری بھی ایک انسان تھا جسے خدا نے اُن کی قوت عجیب وغریب کارناموں اور نشانیوں سے ثابت اور ظاہر کیا یعنی وہ اہم کارنامے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے وسیلے سے تمہارے درمیان سرانجام دیئے جیسا کہ تم کو بھی معلوم ہے۔"

اس ارشاد میں جن جن ملکوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں کئی علاقے وہ ہیں جن میں قوم افغان یعنی سابق جلاوطن بنی اسرائیلی منتشر حالت میں مادیوں یا آریوں کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ سکونت پذیر تھے جیسا کہ پارتھیا یعنی خراسان یا موجودہ افغانستان، میدان یعنی موجودہ دیرو باجوڑ کا علاقہ اور کپدکیا یعنی ضلع مردان پشاور میں کمبل کیا جو موجودہ تربیلہ ڈیم کا مشرقی حصہ ہے۔ ان ممالک میں اس وقت بھی افغان قبائل آباد ہیں جن کے اسلاف وہی جلاوطن بنی اسرائیل تھے۔

الغرض پطرس نے یہودی اور اسرائیلی دونوں کو الگ الگ مخاطب کر کے نصیحت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی وہ لوگ تھے جو وہاں کے گرد ونواح سے آئے تھے اور اسرائیلی سے مراد وہ لوگ تھے جو باہر یعنی مشرق سے آکر وہاں جمع ہوئے تھے جس میں پختون خوا کے علماء وحکماء اور اراکین جرگہ بھی شامل تھے۔

۱۵۔ اسرائیلی انبیاء:۔ جلاوطن اسرائیلی یعنی پختون خوا کی اصلاح اور انہیں راہ راست پہ لانے کے لئے ان کے ہاں اپنے انبیاء علیہم السلام بھی آتے رہے

اُن کے مزارات بھی پختون خوا کے مختلف مقامات پہ اس وقت تک موجود ہیں۔ مثلاً ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ:۔

"بلخ میں حضرت حزقیل نبی کا مزار ہے، اس پہ ایک قبہ بنا ہوا ہے جس کی ہم نے زیارت کی ہے۔"

مصنف زبدۃ الاخبار ہرات کے متعلق عبدالرحمٰن قاضی کی تاریخ قدیم ہرات ابوالعاص کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ:۔

"خراسان میں بہترین مقام ہرات ہے اور اُس پہ ستر انبیاء علیہم السلام نے دعائے خیر کی ہے۔"

جغرافیہ خلافت مشرقی میں درج ہے کہ:۔

"ساوہ کا شہر جو ہمدان اور مرو کے وسط میں خراسان والی شاہراہ پہ واقع تھا اُس کے چار میل مغرب میں حضرت شماؤل نبی کا مزار تھا۔"

مؤلف تاریخ لُبِ لباب لکھتا ہے کہ:۔ کیقباد و کیخسرو پسر غورس یا سائرس کے زمانے میں بلخ اور اس کے اطراف میں بنی اسرائیل کے انبیاء حزقیل، الیاس، الیسع، شماؤل علیہم السلام بیک وقت موجود تھے۔"

ایک اسرائیلی نبی جو غازی پیغمبر سے مشہور ہیں باجوڑ کے جنوبی علاقہ اتمان خیل کے مقام رنگ برنگ میں دفن ہیں، اسی طرح تین اور انبیاء کی قبریں ہیں جن میں ایک بمقام باجکنڈ میں دوسری لیگانڑی علاقہ بونیر میں اور تیسری علاقہ دیر میں تیمرگرہ سے تین میل کے فاصلہ پہ موضع کہنہ ڈھیر والے پرانے رستے کے شمال کنارے پہ واقع ہے۔ مذکورہ مزارات عوام الناس میں مشہور ومعروف ہیں۔

تاریخ انبیاء کا ایک اہم نکتہ

اوپر کی سطروں میں سرزمین بنی اسرائیل کے جن انبیاء کے نام آتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں کے پیغمبر اُن سے پہلے بھی مختلف ادوار ومقامات میں مبعوث

ہوئے تھے مثلاً حضرت الیاس، حضرت شیث وغیرہما علیہم السلام۔ اس سے قارئین کو کسی شبہ میں نہیں پڑ جانا چاہیے۔ یہاں صرف سرزمین بنی اسرائیل کے چند انبیاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انبیاء میں یہ فخر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حاصل تھا کہ وہ اپنے نام کی واحد شخصیت تھے۔ قرآن میں حضرت ذکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت دی تھی کہ "یازکریا انا نبشرک بغلام اسمہ یحییٰ لم نجعل لہ من قبل سمیاہ" (سورہ مریمؑ آیت نمبر ۷) یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل تھا جس کا اعادہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ فرمایا۔

۱۷۔ **زبان**۔ پختو یا پشتو اور سامی زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور پشتو یا پختو میں سامی زبانوں کے الفاظ بکثرت ہیں۔ سامی زبانوں کے متعلق مشہور مؤرخ فلپ کے حتی لکھتا ہے کہ:-

"اشوری، قدیم بابلی (اکادی) کنعانی، فنیقی، حبشی، آرامی، عبرانی، عربی اور سریانی زبان جو آرامی ہی کی ایک شاخ تھی، یہ سب سامی زبانیں ہیں۔ ان تمام زبانوں کے درمیان گہری مماثلت ہے اور بحیثیت مجموعی یہ دوسری زبانوں کے مجموعوں سے جداگانہ ہیں، حضرت ابراہیم اصلاً آرامی تھے اپنے ہم قوموں سے آرامی میں بات چیت کرتے تھے اور وہی عبرانی قوم کے جد امجد ہیں۔ ہاجرہ زوجہ ابراہیمؑ اور ان کا بیٹا اسمعیلؑ یعنی ماں بیٹے کی زبان عبرانی تھی اور آپس میں اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے، حضرت اسمعیلؑ نے عرب کے جرہم قبیلہ میں نکاح کیا اور ان کی اولاد نے اپنی عبرانی زبان چھوڑ کر جرہم قبیلہ سے عربی زبان سیکھی اسی واسطے حضرت اسمعیل کی اولاد کو عرب مستعربہ کہتے ہیں۔ ... عبرانی اگرچہ مرگئی تھی لیکن اس نے بہت سی مہذب زبانوں کے لئے الفاظ کی ایک قیمتی میراث چھوڑ دی ... آرامی زبان سامی بولیوں میں سے ایک تھی، اور آرامی تاجروں نے اسے ابتدا ہی سے دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ آرامی زبان ابتدا میں شامیوں کی تجارتی زبان تھی، ... ۵ قبل از مسیح کے آس پاس یہ پورے ہلال زرخیز میں صرف تجارت

حضارت اور سرکاری کاروبار ہی کی زبان نہ رہی بلکہ باشندوں کی عام بولی بن گئی اور اس نے اپنی تمام ہمسر زبانوں پر جن میں عبرانی بھی شامل تھی، فتح کامل حاصل کرلی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی قوم (یہودیوں) کی زبان یہی تھی اور آرامی زبان کا نفوذ صرف سامی حلقے تک محدود نہ رہا بلکہ دارائے اعظم (۵۲۱ تا ۴۸۶ قبل از مسیح) کے ماتحت آرامی زبان حکومت ایران کے صوبوں کے درمیان روابط کا ذریعہ بن گئی تھی، اس طرح سکندر کی آمد تک یہ زبان ہندوستان و حبشہ کے درمیانی علاقہ کی ایسی بولی بن گئی جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ شمالی عرب کے باشندوں نے بھی اپنی ابجد آرامی ہی سے لی تھی۔ اسی طرح آرمینیوں، ایرانیوں، اور ہندوستانیوں نے آرامی سرچشمے ہی سے فائدہ اٹھاکر اپنی ابجدیں ایجاد کیں، پہلوی (فارسی) اور سنسکرت دونوں زبانوں کے حروف اصلاً آرامی ہیں۔۔۔ اسرائیلی جلاوطنوں میں سے جو لوگ خوشحال تھے انہوں نے مملکت ایران میں ٹھہرے رہنے کو ترجیح دی اور اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ اس عہد کی کاروباری دستاویزوں میں بہت سے عبرانی نام ملتے ہیں"

(تاریخ شام)

اس سلسلہ میں مذکورہ مصنف تاریخ لبنان میں لکھتا ہے:-

"ایرانی سلطنت کی بنیاد سائرس نے رکھی تھی، اس کے بیٹے کیمبی سس، (کمبوجیہ یا کیقباد) اور دارا ورزدے دارائے سلطنت کو اتنا وسیع کر دیا کہ ہندوکش اور دریائے سندھ کے پار سے بحیرۂ ایجہ (غالباً دریائے ستلج) تک اور قفقاز سے بحر ہند تک پھیل گئی (تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ وسیع علاقہ ایک مرکزی سیاسی نظام کے تابع آیا اور یہ نہایت محکم نظام تھا، سلطنت کے دور افتادہ حصے سڑکوں کے نئے نظام نے ملا دیئے اور شاہی قاصدوں کے لیے جابجا قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں، تمام مقامات میں ایک سکہ رائج ہوگیا۔ آرامی زبان اتنی پھیل گئی کہ پوری سلطنت کی عام زبان بن گئی۔ ... اس عہد کی دو بڑی تہذیبوں سامی اور

ہندی و ایرانی کو امتزاج نہیں تو ایک دوسری پہ اثر و نفاذ کا موقع ضرور مل گیا۔
(تاریخ لبنان، فلپ کے حتی)

حرفِ آخر: بیت المقدس پہ اشوریوں اور اس کے بعد بخت نصر کے قبضے اور شام میں تباہی و بربادی کے بعد بنی اسرائیل دنیا میں ہر طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے یا انہیں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل کے سینکڑوں خاندان وہ تھے جو شمال مغرب کی طرف جانے کے بجائے جنوب مشرقی ایشیا کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے یا انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ قبائل بھی گردش لیل و نہار سے محفوظ نہ رہے، ان کی زندگی مختلف نشیب و فراز سے گزری، البتہ انہوں نے اپنی مذہبی روایات کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا، سیاسی قوت و اقتدار بھی حاصل کیا غربت و مسکنت کی زندگی بھی گزاری اور زندگی کے زوال اور ناکامیوں کا مزا بھی چکھا تا آنکہ اسلام کے ظہور کے بعد اُن میں ایک نئی زندگی کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے اور نشاۃ ثانیہ کے دور میں قدم رکھا، افغانستان، پاکستان، ہندوستان وغیرہ میں جو افغان موجود ہیں یہ دراصل انہی جلاوطن یا مجبور بنی اسرائیل خاندانوں کے باقیات ہیں، اور اسلام کے شرف و برکت کی وجہ سے تو انہیں باقیات الصالحات کہنا چاہیے۔

دنیا کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں بنی اسرائیل کے یہ مختلف خاندان اور گروہ جس طرح پھیلے اور جس طرح وہ اللہ کی نوازشوں کے مستحق ٹھہرے یا آزمائشوں کے مختلف ادوار ان کی زندگی میں آئے جس طرح وہ اپنی قومی زندگی میں امن و آسائش اور ابتلاء و آزمائش کے مختلف ادوار سے گزرے اسی طرح ان میں ایک وقت میں بھی اچھے اور برے اور عالم و جاہل ہر طرح کے لوگ موجود رہے۔ قرآن حکیم کی ایک آیت میں اُن کی قومی زندگی کے اس انداز کی طرف بڑا بلیغ اشارہ موجود ہے۔

وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا مِّنْهُمُ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَٰلِكَ وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ٥
(سورہ اعراف، آیت ۱۶۸)

اور ہم نے انھیں الگ الگ گروہ کر کے زمین میں منتشر کر دیا کچھ ان میں نیک تھے، کچھ اس کے خلاف (یعنی بد) اور ہم نے انھیں اچھی اور بری دونوں طرح کی حالتوں میں ڈال کر آزمایا تاکہ (بدعملیوں سے) باز آجائیں۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں بنی اسرائیل کی قومی زندگی کے جن خصائص یعنی دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں میں ان کے پھیلاؤ، جماعتی زندگی کے ادبار و انتشار اور قبضہ و اقتدار، نیکی و سعادت اور بے عملی و شقاوت، علم و فضل اور جہل و نادانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ پختون خوا کی زندگی میں آج بھی بچشم حقیقت بین سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس کے باوجود کہ اس سے پٹھانوں کی زندگی کی بعض خامیاں تاریخ کی روشنی میں آتی ہیں لیکن ان کی نسلی تاریخ کی یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پختون خوا بنی اسرائیل کی اُس جماعت کی مذہبی و اخلاقی روایات کے وارث ہیں جس کو قرآن نے "الصلحون" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اگرچہ ہمارے عقیدے کے مطابق تاریخ عالم "دون ذلک" کی مثال سے بھی خالی نہیں لیکن ہم یہاں اپنے صرف اس اختصاص کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہمارے قدیم اسلاف کو اللہ تعالیٰ نے شریعت موسوی اور ہدایت عیسوی کی شکلوں میں اپنی ہدایت پر عمل کی توفیق بخشی تھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بعد ہمارے بزرگوں کو اور ہمیں دین اسلام کی سعادت سے نوازا اور شریعت محمدی کی پیروی کی توفیق بخشی۔ والحمد للہ علیٰ ذلک

روشن خان
موضع نواں کلی، تحصیل صوابی، ضلع مردان
پشاور (پاکستان)

اعتراف خدمت - ایک خط

No. D. 2883/EM/80

MINISTER FOR EDUCATION
Government of Pakistan
Islamabad

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۸۰ء

محترم روشن خان صاحب

السلام علیکم ۔

اس سے قبل میں نے آپ کو " تذکرہ " کے بارے میں ایک خط لکھا تھا ۔ اس وقت میں نے کتاب کو نہیں پڑھا تھا ۔ پڑھنے کے بعد میں آپ کو آپکی کاوشوں پر مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے پختونوں کی اصلیّت اور ان کی تاریخ کے بارے میں بے انتہا تحقیق کی ہے ۔ اور اس ضمن میں کافی گتھیوں کو سلجھایا ہے ۔

یہ چند چیزیں جو میں آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں سرسری ورق گردانی کا نتیجہ ہیں ۔ انشاءاللہ جب کسی وقت ملاقات ہو گی تو بہت سی چیزوں پر بحث کرنی مطلوب ہے ۔ اللہ تعالی آپ کو اس بارے میں مزید لکھنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

امید ہے کہ آپ بمع اہل و عیال بخیر و عافیت ہوں گے ۔

فقط والسلام

آپ کا مخلص

(دستخط)

(محمد علی خان)

جناب خان روشن خان صاحب
نواں کلی
تحصیل صوابی
ضلع مردان ۔

تذکرہ

ایک ادیب اور صحافی کی نظر میں

خان روشن خان نے پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ کے موضوع پر "تذکرہ" کے عنوان سے ایک کتاب شایع کی جس کا پہلا ایڈیشن شایع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے خان صاحب موصوف نے اس ایڈیشن میں کئی بیش بہا اضافے کیے ہیں اور نہایت تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ افغان خاندان کی ایک بزرگ خاتون حضرت صفیہؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں شمولیت کی سعادت اور تمام روئے زمین کے مسلمانوں اور توحید پرستوں کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ دوسرا اہم اضافہ قندھار میں بنی اسرائیل کے قدیم آثار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانوں کی تاریخ کتنی قدیم اور ہنگامہ خیز رہی ہے۔

"تذکرہ" میں خان صاحب نے پٹھانوں کی اصل نسل پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ اس کتاب کا خاص موضوع ہے خان صاحب کا تعلق محققین کے اس گروہ سے ہے جو پٹھانوں کو بنی اسرائیل قرار دیتے ہیں۔ اپنے اس دعوے کو انہوں نے پٹھان اور غیر پٹھان، قدیم اور جدید مورخوں، تذکرہ نگاروں اور سوانح نویسوں اور محققوں کے بیانات سے "تاریخ و آثار" کے حوالوں سے اور بنی اسرائیل اور پٹھانوں کے رسوم و رواج، عادات واطوار، شکل و شمائل کے تقابلی جائزے سے اور عبرانی و کلدانی اور پشتو زبانوں کے موازنے اور ہر قسم کے قوی دلائل سے ثابت کر دیا ہے۔

خان روشن خان کی یہ تصنیف (تذکرہ) تصویروں اور نقشوں سے مزین ہے جس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس کی کتابت و طباعت سے ان کے اعلیٰ ذوق اور سلیقے کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی اس علمی و تحقیقی کاوش کو ہر مکتب فکر کے دانشوروں نے سراہا ہے اور اہل علم و اصحاب قلم نے تذکرہ کے تحقیقی معیار اور درجۂ استناد کا اعتراف کیا ہے۔

محمد شفیع صابر
ایڈیٹر ترجمان سرحد

---

۲۹ مئی ۱۹۸۱ء کی اشاعت ہفت روزہ ترجمان سرحد پشاور میں ایک مفصل اور دلنشین تبصرہ "تذکرہ (پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ)" پر شائع ہوا تھا، یہ مضمون اسی کا ملخص ہے۔

تذکرہ

ایک عالم اور محقق کی نظر میں

پشتون قوم کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسے خان روشن خان جیسا عالی دماغ، روشن خیال اور صاحب ایثار خادم میسر آیا جس نے اپنے بہترین اوقات اور اعلیٰ ذہنی و فکری صلاحیتوں کو پشتونوں کی تاریخ کے مطالعہ و تحقیق کے لیے وقف کیا اور صرف زر کثیر سے پشتونوں کی تاریخ کے موضوع پر پشتو اور اردو زبان میں کئی تصانیف اور ان کے متعدد ایڈیشن شایع کر کے ایک قابل تقلید اور لائق صد تحسین مثال قائم کی۔ خان صاحب نے افغانوں کے قبائل اور ان کے خاندانوں کی تاریخ کی تحقیق و اشاعت میں جو سرگرمی دکھائی ہے اور ایثار کا نمونہ پیش کیا ہے اور شجروں کی تحقیق و تاریخی نقشوں کی ترتیب و تدوین میں جس جانفشانی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال ہمارے ملک میں تو کجا مغربی ترقی یافتہ ملک میں بھی شاذ کے درجے میں ملے گی۔

روشن خان صاحب ایک شوقین طالب علم اور سچے محقق کی طرح اپنے موضوع پر مواد کے حصول کے لیے ہر وقت بے چین اور متجسس رہتے ہیں اور پھر اپنے مطالعہ و تحقیق کے نتائج کو حسن ترتیب کے ساتھ زر کثیر خرچ کر کے تاریخ کے طلبہ کے لیے پیش کرتے ہیں۔ تواریخ حافظ رحمت خانی کا پشتو ایڈیشن پھر اس کے دو اردو ایڈیشن جو تحقیق و تدوین کی ایک مثال ہیں۔ اس کے بعد تذکرہ کی اشاعت اب اس کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن خان صاحب موصوف کے ذوق علم و تحقیق، خدمت قوم اور ایثار وقت و مال کی لائق تحسین مثال ہے۔

خان صاحب نے جبرائی (آرامی) اور پشتو زبان کے تعلق سے علم لسانیات کے جن مباحث اور تاریخ کے جن اہم نکات کی طرف اشارات کیے ہیں اور روشنی ڈالی ہے ضرورت ہے کہ ان میں سے ایک ایک بحث پر الگ الگ تحقیق کی جائے۔ توقع ہے کہ پشتو زبان، ادب اور افغانوں کی تاریخ کا ذوق رکھنے والے اسکالر ان موضوعات پر توجہ فرمائیں گے۔ روشن خان صاحب نے پشتونوں کی تاریخ اور ادبیات کی تحقیق کے لیے بنیاد رکھ دی ہے اب یہ ہمارے ریسرچ اسکالرز کا کام ہے کہ وہ اس پر تنقیدی نظر بھی ڈالیں اور خان صاحب کی تقلید کرتے ہوئے ذہنی اور شخصی اغراض اور لوٹ و لالچ سے بے نیاز ہو کر کامل خلوص، علمی و تاریخی ذوق، خدمت قوم کے سچے جذبے کے ساتھ ان بنیادوں پر علم و تحقیق کی عظیم الشان اور فلک بوس عمارت تعمیر کریں اور اپنی مثال دوسروں کیلئے نمونہ چھوڑیں۔

مجھے امید ہے کہ جناب روشن خان کی تالیف "تذکرہ" کی دوسری اشاعت جس میں کئی قیمتی مضامین، مفید مباحث اور نہایت اہم تصویروں کا اضافہ ہوا ہے، علمی حلقوں میں تحسین کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔

(مولانا) فضل محمود

[illegible]

* مولانا فضل محمود صاحب نے تذکرہ کی پہلی اشاعت پر [illegible] پشاور کے شمارہ [illegible] تذکرہ کا دوسرا ایڈیشن موصوف کی نظر سے گذرا [illegible] خیالات اس تذکرہ [illegible] سے ماخوذ ہیں۔

تذکرہ

(پٹھانوں کی اصلیت اور اُن کی تاریخ)

تواریخ حافظ رحمت خانی کی ترتیب اور محققانہ حواشی کے بعد پٹھانوں کی تاریخ پر

خان روشن خان کی ایک اور اہم تصنیف

اقوام عالم میں پٹھانوں کی تاریخ سب سے زیادہ شاندار رہی ہے۔ پٹھانوں کا تعلق حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل (بنی اسرائیل) سے ہے جس میں سب سے زیادہ تاریخ ساز سلاطین و ملوک اولوالعزم فاتح اور سپہ سالار بڑے بڑے حکما اور فلاسفر اکابر صوفیہ و مشائخ انا صل علماء و فقہا اور جلیل القدر حاملین علوم نبوت گزرے ہیں کرۂ ارضی کا بیشتر حصہ سب سے زیادہ طویل زمانے تک پٹھان قوم کے زیر نگیں رہا ہے لیکن تاریخ کے سب سے زیادہ اور بڑے مظالم بھی میدان جنگ کے قتل و نہب اور جلاوطنی کے حادثات عظیمہ کے بعد پٹھانوں کی تاریخ پر روا رکھے گئے ہیں۔

تذکرہ میں

پٹھانوں کے خاندانوں ان کے اکابر ان کی تاریخ اور ان کی اصل و نسل کے بارے میں تاریخ کی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا پہلی مرتبہ علمی اور تحقیقی انداز میں پردہ چاک کر دیا گیا ہے

اس کا مقدمہ

مشہور ادیب اور محقق ڈاکٹر **ابو سلمان شاہجہانپوری** نے لکھا ہے

اہم تاریخی و تحقیقی اضافوں اور تصحیح کے بعد **چوتھا ایڈیشن**

اعلیٰ درجے کا آفسٹ پیپر، بہترین کتابت، خوبصورت جلد، ۴۲۸ صفحے، قیمت ۲۷ روپے

ملنے کا پتہ

روشن خان اینڈ کمپنی، تاکوڈ بلڈنگ، پھول چوک، جونا مارکیٹ، کراچی ۲